ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ محدث

لاہور پاکستان

مدیر اعلیٰ

حافظ ڈاکٹر عبدالرحمن مدنی

مدیر

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

386 | فروری 2020

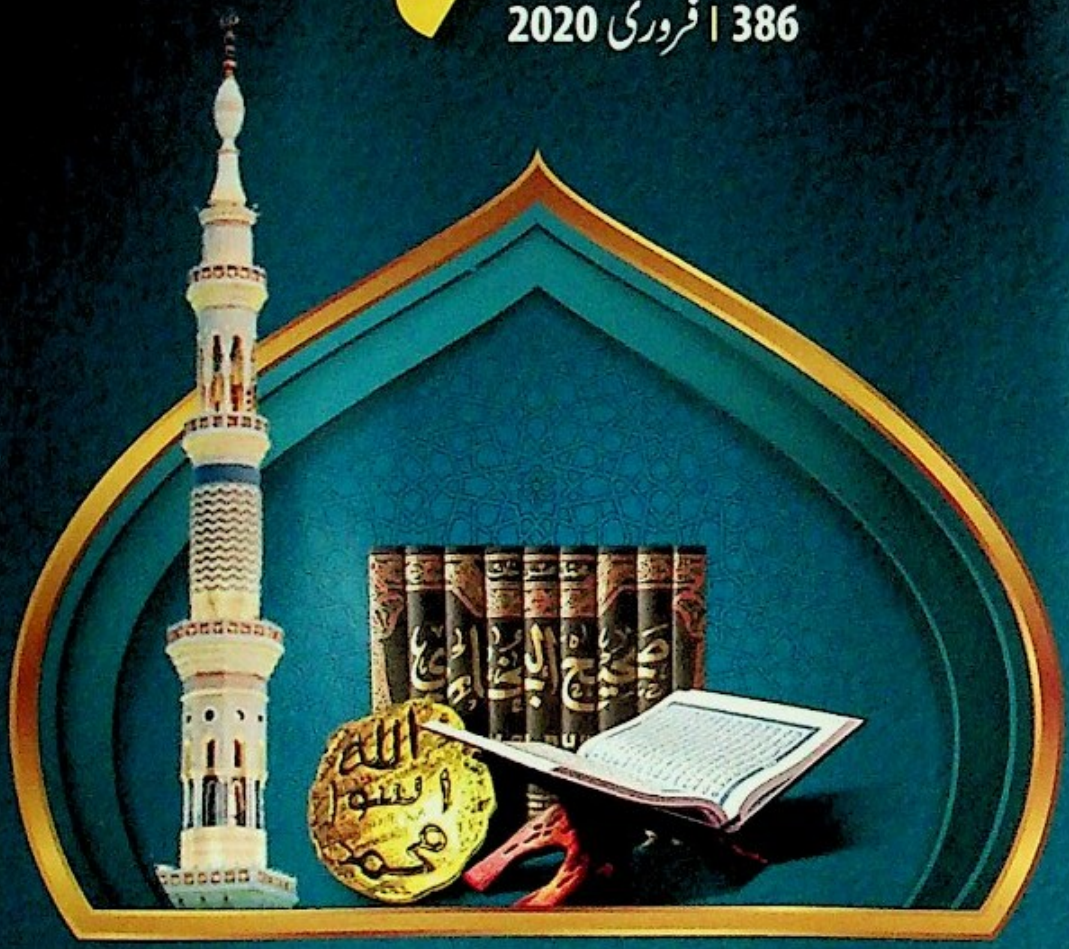

4 مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ کا دوغلا کردار

27 مسلم حکومت میں غیر مسلموں پر عائد شرائط

55 منصبِ امامت کے بارے میں دینی راہ نمائیاں

جامعہ لاہور الاسلامیہ

مجلس التحقیق الاسلامی

تبلیغ دین کے لیے مجلس التحقیق الاسلامی کی عظیم الشان

ویب سائٹس

محدث
Mohaddis.com

محدث لائبریری
Kitabosunnat.com

محدث فتویٰ
UrduFatwa.com

محدث میگزین
Magazine.Mohaddis.com

محدث فورم
Forum.Mohaddis.com

زیرسرپرستی	زیرنگرانی	علمی معاونت	فنی معاونت
ڈاکٹر حافظ عبدالرحمن مدنی	ڈاکٹر حافظ انس نضر	قاری مصطفیٰ راسخ	انجینئر محمد شاکر اعوان
ڈاکٹر حافظ حسن مدنی	ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی	قاری خضر حیات	انجینئر عمیر حسن راجہ

خصوصیات

- اسلامی کتب، مضامین اور فتاویٰ کے لیے مقبول ترین اور روزانہ اپڈیٹ ہونے والی ویب سائٹس۔
- اسلامی لٹریچر اور شرعی مسائل کے لیے دنیا بھر سے ملنے والے مطالبوں کی تکمیل
- یومیہ مناسبت کے مطابق خصوصی مضامین
- تمام ویب سائٹس اردو زبان میں
- تمام ویب سائٹس پر تبصرے وجائزے اور تاثرات وشماریات کی سہولت

جاری پروگرام

محدث
Mohaddis.com
احادیث نبویہ کا عظیم ذخیرہ، ترجمہ اور تحقیق وتخریج کی سہولت کے ساتھ

محدث لائبریری
Kitabosunnat.com
- یومیہ 3 کتب کا اضافہ (PDF)
- حالات کی مناسبت سے اہم مضامین

محدث فتویٰ
UrduFatwa.com
- تمام سلفی مطبوعہ فتاویٰ جات کی اپ لوڈنگ (نئے پیش آمدہ مسائل کے فوری جوابات)

محدث میگزین
Magazine.Mohaddis.com
47 سال کے مطبوعہ تمام شمارے
(Unicode / PDF)

محدث فورم
Forum.Mohaddis.com
موضوعات: 34,261 ترسیلات: 279,857
اراکین: 4930

یومیہ 25000 وزیٹر
ہر لمحہ 3000 قارئین

مستقبل کے منصوبے

- محدث یونیکوڈ لائبریری
- محدث بلڈ بنک
- محدث آڈیو، ویڈیو سیکشن
- رسائل وجرائد سیکشن

ماہانہ اخراجات سوا تین لاکھ روپے

زیر اہتمام: مجلس التحقیق الاسلامی J-99 ماڈل ٹاؤن، لاہور
Mobile:+92 322 7222288
anasnazar99@gmail.com
Account: kitabosunnat.com, 0093-01875659, Bank AlFalah, Urdu Bazar, Lahore Swift Code: ALFPKKA093
Designing: AK 0321-4966404

سنتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

ماہنامہ

محدث

لاہور پاکستان

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر حافظ عبدالرحمن مدنی

مدیر

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

جلد 51 | فروری 2020ء / جمادی الثانی 1441ھ | عدد 01

مجلس مشاورت

▪ حافظ صلاح الدین یوسف ▪ ڈاکٹر محمد حماد لکھوی ▪ ڈاکٹر محمد اسحاق زاہد

▪ ڈاکٹر حافظ انس مدنی ▪ ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی ▪ ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

فہرست مضامین

فکر و نظر — ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ کا دوغلا کردار (4)

سیاست شرعیہ — ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

مسلم حکومت میں غیر مسلموں پر عائد شرائط (27)

حدیث و سنت — محمد نعمان فاروقی

منصب امامت کے بارے میں دینی راہ نمائیاں (55)

تفہیم عصر حاضر — ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

حق خود ارادی اور جہاد اسلامی میں باہمی تضاد (80)

تہذیب اسلامی — اوریا مقبول جان

سو فیصد تعلیم یافتہ اسلامی ہندوستان کو اَن پڑھ کس نے بنایا؟ (90)

مینجر / ترسیل

محمد اصغر 0305 4600861

زرسالانہ	300/= روپے
فی شمارہ	60/= روپے

بیرون ملک

زرسالانہ	20/= ڈالر
فی شمارہ	4/= ڈالر

Monthly Muhaddis
A/c No: 984-8
UBL-Model Town
Bank Squre Market, Lahore.

دفتر کا پتہ

99 جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700

042-35866396, 35866476

Email:
Mohaddislhr@gmail.com

Publisher:
Hafiz Abdur Rahman Madni

Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore.

Islamic Research Council

محدث کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کلی اتفاق ضروری نہیں!

مسئلہ کشمیر پر اقوامِ متحدہ کا دوغلا کردار اور ملتِ اسلامیہ

جہاں 'حق خود ارادی' کے مغربی ڈھونگ کی حقیقت کھلتی ہے!

زیر نظر تحریر سے قبل 'حق خود ارادی اور جہاد' پر اسی شمارے میں شائع شدہ راقم کے اُصولی مضمون کا مطالعہ مناسب ہو گا، جو مسئلہ کشمیر کے تناظر میں ہی لکھا گیا ہے۔ (ح۔م)

مسئلہ کشمیر کے دو حل ہیں: ایک اسلامی جہاد اور دوسرا مغربی حق خود ارادی۔ تقسیم ہند کے وقت جہاد کی بجائے، حق خود ارادی کے ذریعے اُن خطوں کو پاکستان سے ملانے کا فیصلہ کیا گیا، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ پھر اس وقت موجود متعدد خود مختار ریاستوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو پاکستان یا بھارت کے ساتھ اپنا الحاق کر سکتے ہیں۔ جب کشمیری راجہ ہری سنگھ نے اس سے انکار کیا تو پاکستان نے آزادی کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء میں کشمیری عوام کی داخلی تائید کے ساتھ، جہاد کے ذریعے اس خطے کو اپنے ساتھ ملانے کی جدوجہد کی۔ اس موقع پر اقوام متحدہ عالمی طاقتوں کے جلو میں اپنے الحادی نظریۂ حق خود ارادی کے ساتھ نمودار ہوئی اور اس نے پاکستان و بھارت کو حکم امتناعی جاری کرتے ہوئے، کشمیری عوام کے لئے حق خود ارادی اور ووٹنگ کی ضمانت دی۔ پھر مغربی ممالک اور اقوام متحدہ کا اپنا نعرہ اس کے گلے کی پھانس بن گیا، چنانچہ اگلے ستر سال اسی ٹال مٹول میں گزر گئے کہ جہاد کا راستہ بند کرنے والی اقوام متحدہ نے کشمیریوں کو ان کا مسلمہ انسانی حق بھی نہ لے کر دیا۔ کیونکہ اقوام متحدہ کی سرکردہ طاقتیں اسلام یا الحاد، کسی بھی صورت میں مسلمانوں کو ریلیف دینے کو تیار نہیں، چاہے ان کے مسلمہ نظریات کا بھانڈا پھوٹ جائے۔

کشمیر کو اس وقت انڈیا کی وفاقی حکومت کے زیر انتظام کر کے درحقیقت اسے مسئلہ فلسطین بنانے کی پیش بندی کی جا رہی ہے، جس میں فلسطینیوں کی اکثریت کو چند دہائیوں میں اقلیت میں بدلنے کے بعد، آئے روز ان پر نئے مظالم کی داستان رقم کی جاتی ہے، اور دنیا ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم' کی مصداق بنی بیٹھی ہے۔ یہی

1 en.wikipedia.org/wiki/Indo-Pakistani_War_of_۱۹۴۷–۱۹۴۸
https://www.bbc.com/urdu/regional-41719885

صورت حال کشمیر کے تاریخی حصے چین کے صوبہ سنکیانگ میں نصف صدی سے جاری ہے جس کے نتیجے میں ۱۹۴۸ء کے ۹۴ فیصد اکثریتی ۳ کروڑ مسلمان اس وقت چینی جبر واستبداد کے بعد ۴۸ فیصد کی کمتر اقلیت میں بدل چکے ہیں۔ اور انہیں اسلام سے مزید منحرف کرنے کی کوشش جاری ہے۔ امریکہ فلسطین میں غاصب یہودی طاقتوں کا پشتیبان اور سنکیانگ میں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے پابندیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ بہر حال کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کے دوغلے کردار کا نکات آئینہ درج ذیل ہے:

مقبوضہ کشمیر کے حالیہ حقائق

۵/ اگست ۲۰۱۹ء کو بھارت نے دستوری دہشت گردی کر کے، 'اپنے زیر انتظام کشمیر' میں کشمیریوں کے شہری حقوق پر دست درازی کر دی اور ماضی میں مہاراجہ کشمیر سے طے پانے والے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کشمیریوں کو فلسطین کے باشندوں کی طرح اپنے ہی وطن میں اجنبی بنانے کا اقدام کر لیا۔

بھارتی آئین کے آرٹیکل ۳۷۰ کے ذریعے "کشمیر کو بھارت کی دیگر ریاستوں سے خصوصی حیثیت دی گئی تھی اور اس کے تحت دفاع، مواصلات اور خارجہ اُمور کے علاوہ کسی اور معاملے میں مرکزی حکومت یا پارلیمان ریاست میں ریاستی حکومت کی توثیق کے بغیر بھارتی قوانین کا اطلاق نہیں کر سکتی تھی۔"

آرٹیکل ۳۵/اے کے مطابق

"کوئی شخص صرف اسی صورت میں جموں کشمیر کا شہری ہو سکتا ہے، اگر وہ یہاں پیدا ہوا ہو۔ کسی بھی دوسری ریاست کا شہری جموں کشمیر میں جائیداد نہیں خرید سکتا اور نہ ہی یہاں کا مستقل شہری بن سکتا ہے۔"

اب ان قوانین کے خاتمے کا نتیجہ یہ ہے کہ انڈیا کے ایک ارب، ۱۰ کروڑ سے زائد غیر مسلم بھی وہاں زمین کی خرید وفروخت کر سکتے ہیں تو پھر کشمیری عوام کی اکثریت تحلیل ہونے میں چند ماہ کا عرصہ ہی درکار ہے جو تاریخی طور پر ۹۶ فیصد مسلم اکثریت پر مشتمل رہی ہے۔

کشمیر کے بارے میں ظالمانہ بھارتی قانون کے بعد، ۵/ اگست ۲۰۱۹ء سے مقبوضہ جموں کشمیر میں جاری سماجی پابندیوں کو چھ ماہ/ ۲۰۰ دن سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ ہزاروں اضافی فوجی تعینات کرنے کے بعد مسلسل دفعہ ۱۴۴ یعنی کرفیو نافذ ہے۔ ۹۰ لاکھ سے زیادہ مسلمان اس تہذیب یافتہ دور میں نقل وحرکت، ابلاغی رابطوں

اور مذہبی وسیاسی آزادی کے بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ بھارتی سپریم کورٹ [1] اور امریکہ محکمہ خارجہ [2] کے آزادی اور حالات کو معمول پر لانے کے احکامات سمیت اقوام متحدہ کے معتبر عالمی پلیٹ فارم پر ان مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور دہائی دی جاچکی ہے، لیکن بھارتی سرکار اپنے ظلم وجبر میں اندھی ہوچکی ہے۔ سری نگر کی جامع مسجد میں اذان وباجماعت نماز سمیت، وادی میں تمام مذہبی وسیاسی اجتماعات پر پابندی ہے۔ کشمیریوں کو اپنے بارے میں خبریں بیرونی دنیا سے ملتی ہیں، خود آپس میں ان کا رابطہ ممکن نہیں۔ سرکاری مرکز میں چند گھنٹوں کے لئے برائے نام چھ کمپیوٹرز پر انٹرنیٹ کو صحافیوں کے لئے کھولا [3] جاتا ہے۔

نام نہاد تہذیب وتمدن کے اس دور میں انسانوں کی اتنی بڑی تعداد بنیادی حقوق سے محروم ہے، لیکن عالمی برادری اور اقوام متحدہ کسی سنجیدہ اقدام پر غور نہیں کر رہی۔ امریکہ نے چین پر سنکیانگ کے مسلمانوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے بعد پابندیوں کا بل تو کانگریس میں پیش کر دیا ہے، لیکن انڈیا کے کھلے مظالم کے بارے اس کی آنکھیں بند ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مغربی اقوام کو غیر جانبدار

---

۱ بچوں کے حقوق کے لئے کام کرنے والی اناکشی گنگولی نے درخواست میں کہا کہ مودی حکومت نے جموں وکشمیر میں آرٹیکل ۳۷۰ منسوخ کرنے کے بعد سے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور مکمل لاک ڈاؤن ہے۔ اس کے نتیجے میں کشمیری بچے اور کم عمر لڑکے انتہائی مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہیں۔ بھارتی چیف جسٹس رنجن گوگوئی نے ریمارکس دیے کہ جموں وکشمیر ہائی کورٹ پہنچنا کیوں مشکل ہے، کیا کوئی راستہ روک رہا ہے؟ "ہم ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے صورتحال جاننا چاہتے ہیں، اگر لوگ ہائی کورٹ نہیں پہنچ پارہے تو یہ بہت ہی سنگین معاملہ ہے، ضرورت پڑنے پر میں خود سری نگر جاؤں گا۔ سپریم کورٹ نے حکومت کو حکم دیا کہ "جموں وکشمیر کی صورتحال فی الفور معمول پر لائی جائے، لوگوں کو طبی سہولیات کی فراہمی یقینی بنائی جائے۔ سپریم کورٹ نے کانگریس کے رہنما غلام نبی کو بھی وادی کا دورہ کرنے اور وہاں کشمیریوں سے ملاقات کی اجازت دے دی۔" (روزنامہ نوائے وقت، ۱۶ر ستمبر ۲۰۱۹ء)

۲ نیویارک میں امریکی دفتر خارجہ کی سینئر اہلکار ایلس ویلس کا کہنا تھا کہ امریکا جلد از جلد کشمیر میں معمولات زندگی بحال ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ بھارتی حکومت کے اگست میں کیے گئے اقدامات کے بعد سے امریکا کا مسلسل یہ موقف رہا ہے کہ کشمیر میں پابندیاں ختم کی جائیں، بھارتی حکومت کشمیری رہنماؤں سے بات چیت کرے اور وعدے کے مطابق وہاں جلد انتخابات کا اعلان کرے۔

https://www.dw.com/ur/a-۵۰۶۳۱۰۰۱ dated 29 sep.2019

۳ "صحافیوں کا کہنا ہے کہ کسی طرح اگر خبر بھیج بھی دیں تو ادارے اس میں کانٹ چھانٹ کر دیتے ہیں۔ صحافی رفیعہ نور ایک ہندی اخبار کے لیے کام کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ ایک عشرے سے زیادہ وقت سے صحافت میں ہیں لیکن ایسی صورت حال کبھی سامنا نہیں کیا "ہمیں لگتا ہے کہ ہم گزشتہ چار ماہ سے پتھر کے زمانے میں جی رہے ہیں۔ ایک طرف صحافتی کام مشکل ہوگیا ہے تو دوسری جانب کشمیر کی حقیقت کو پیش نہیں کر سکتے۔ اتنے مخدوش حالات کے باوجود ایڈیٹر صورت حال کو نارمل بتانے پر زور دیتے ہیں۔ دفتر سے ہدایات آتی ہیں کہ کیا لکھنا، کیا نہیں لکھنا۔"

https://www.dw.com/ur/a-۵۱۶۱۴۲۶۸ dated ۱۰th Dec ۲۰۱۹

مانیں۔ کشمیر پر مسلسل پابندی کے بعد اور مزید کس دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ بھارتی حکومت بدترین جبر و استحصال کے ستر سالوں کے باوجود بھی کشمیریوں کا فیصلہ تبدیل نہیں کر سکی۔ انٹرنیٹ پر پابندی کا اس کے سوا کیا مطلب ہے کہ مودی سرکار اپنے کشمیری مظالم پر دنیا کو لاعلم اور بے خبر رکھنا چاہتی ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے شہری ۱۴ر اگست کو یوم آزادی منا کر ہمیشہ سے پاکستان کے ساتھ اپنے تعلق کو واضح کرتے رہے ہیں۔

کشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت کے خاتمے سے متعلق بھارتی فیصلے پر عمل درآمد کرتے ہوئے جموں و کشمیر کو دو مختلف خطوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ صدر رام ناتھ کووند کے آرٹیکل ۳۷۰ ختم کرنے کے حکم نامے پر دستخط کرنے کے بعد مقبوضہ کشمیر کی خصوصی حیثیت ۳۰ر اکتوبر ۲۰۱۹ء کو ختم ہو گئی ہے۔ ایک حصہ جموں و کشمیر جب کہ دوسرا بدھ مت کے پیروکاروں کی اکثریت والا لداخ قرار پایا ہے۔ ان دونوں کا انتظام نئی دہلی کی وفاقی حکومت کے ذمے کر دیا گیا ہے۔ جموں اور وادی کے لیے گریش چندر مرمو کو اور لداخ کے لیے آر کے ماتھر کو گورنر مقرر کیا ہے۔ بھارتی حکومت اس علاقے میں تمام ہندوستانیوں کو جائیداد کی خرید و فروخت کی اجازت دے کر، ایک طرف کشمیری مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں بدلنا چاہتی ہے اور وہاں اقتصادی ترقی کی رفتار بڑھانے اور ملازمت کے مواقع پیدا کرنے کے سفانطے دیتی ہے، تاکہ کشمیر میں دہائیوں سے جاری تحریک آزادی کسی طرح کمزور پڑ جائے۔

کشمیر کے مرکزی شہر سری نگر میں سڑکیں وغیرہ مسلسل ویران ہیں۔ مقامی افراد نے احتجاجاً دکانیں بھی بند رکھی ہوئی ہیں۔ کسی ممکنہ ناخوشگوار واقعے سے نمٹنے کے لیے پولیس اور فوج کی بھاری نفری تعینات ہے۔ تاہم سری نگر سے پتھراؤ کرنے کے بیس واقعات کی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں۔[1]

جنوری کے وسط میں بھارتی سپریم کورٹ کے تین ججز پر مشتمل بنچ نے انٹرنیٹ پر مستقل پابندی کو بنیادی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے، پابندیوں کے متعلق فیصلہ سنایا:

> "انٹرنیٹ کو اظہار کی آزادی کے بنیادی حقوق کا حصہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ انٹرنیٹ پر غیر معینہ مدت کی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ دفعہ ۱۴۴ کے تحت مظاہروں اور جلسے جلوسوں پر پابندی کا ذکر کرتے ہوئے کہا اس کا نفاذ جمہوری حقوق کو دبانے کے لیے نہیں کیا جانا چاہیے۔۔ عوام کو حکومت سے اختلاف کے پرامن اظہار سے نہیں روکا جا سکتا۔"[2]

---

۱ روزنامہ نوائے وقت: ۳۱ر اکتوبر ۲۰۱۹

اور مذہبی وسیاسی آزادی کے بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ بھارتی سپریم کورٹ[1] اور امریکہ محکمہ خارجہ[2] کے آزادی اور حالات کو معمول پر لانے کے احکامات سمیت اقوام متحدہ کے معتبر عالمی پلیٹ فارم پر ان مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور دہائی دی جاچکی ہے۔ لیکن بھارتی سرکار اپنے ظلم وجبر میں اندھی ہو چکی ہے۔ سری نگر کی جامع مسجد میں اذان و باجماعت نماز سمیت، وادی میں تمام مذہبی وسیاسی اجتماعات پر پابندی ہے۔ کشمیریوں کو اپنے بارے میں خبریں بیرونی دنیا سے ملتی ہیں، خود آپس میں ان کا رابطہ ممکن نہیں۔ سرکاری مرکز میں چند گھنٹوں کے لئے برائے نام چھ کمپیوٹرز پر انٹرنیٹ کو صحافیوں کے لئے کھولا[3] جاتا ہے۔

نام نہاد تہذیب وتمدن کے اس دور میں انسانوں کی اتنی بڑی تعداد بنیادی حقوق سے محروم ہے، لیکن عالمی برادری اور اقوام متحدہ کسی سنجیدہ اقدام پر غور نہیں کر رہی۔ امریکہ نے چین پر سنکیانگ کے مسلمانوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے بعد پابندیوں کا بل تو کانگریس میں پیش کر دیا ہے، لیکن انڈیا کے کھلے مظالم کے بارے اس کی آنکھیں بند ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مغربی اقوام کو غیر جانبدار

---

۱ بچوں کے حقوق کے لئے کام کرنے والی اناکشی گنگولی نے درخواست میں کہا کہ مودی حکومت نے جموں وکشمیر میں آرٹیکل ۳۷۰ منسوخ کرنے کے بعد سے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور مکمل لاک ڈاؤن ہے۔ اس کے نتیجے میں کشمیری بچے اور کم عمر لڑکے انتہائی مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہیں۔ بھارتی چیف جسٹس رانجن گوگوئی نے ریمارکس دیے کہ جموں وکشمیر ہائی کورٹ پہنچنا کیوں مشکل ہے، کیا کوئی راستہ روک رہا ہے؟ ہم ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے صورتحال جاننا چاہتے ہیں، اگر لوگ ہائی کورٹ نہیں پہنچ پا رہے تو یہ بہت ہی سنگین معاملہ ہے، ضرورت پڑنے پر میں خود سری نگر جاؤں گا۔ سپریم کورٹ نے حکومت کو حکم دیا کہ "جموں وکشمیر کی صورتحال فی الفور معمول پر لائی جائے، لوگوں کو طبی سہولیات کی فراہمی یقینی بنائی جائے۔ سپریم کورٹ نے کانگریس کے رہنما غلام نبی کو بھی وادی کا دورہ کرنے اور وہاں کشمیریوں سے ملاقات کی اجازت دے دی۔" (روزنامہ نوائے وقت: ۱۶ ستمبر ۲۰۱۹ء)

۲ نیویارک میں امریکی دفتر خارجہ کی سینئر اہلکار ایلس ویلس کا کہنا تھا کہ امریکا جلد از جلد کشمیر میں معمولات زندگی بحال ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ بھارتی حکومت کے اگست میں کیے گئے اقدامات کے بعد سے امریکا کا مسلسل یہ موقف رہا ہے کہ کشمیر میں پابندیاں ختم کی جائیں، بھارتی حکومت کشمیری رہنماؤں سے بات چیت کرے اور وعدے کے مطابق وہاں جلد انتخابات کا اعلان کرے۔

hllps://www.dw.com/ur/a-۵۰۶۳۱۰۰۱ dated: 29 sep.2019

۳ "صحافیوں کا کہنا ہے کہ کسی طرح اگر خبر بھیج بھی دیں تو ادارے اس میں کانٹ چھانٹ کر دیتے ہیں۔ صحافی رضیہ نور ایک ہندی اخبار کے لیے کام کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ ایک عشرے سے زیادہ وقت سے صحافت میں ہیں لیکن ایسی صورت حال کبھی سامنا نہیں کیا: "ہمیں لگتا ہے کہ ہم گزشتہ چار ماہ سے پتھر کے زمانے میں جی رہے ہیں۔ ایک طرف صحافتی کام مشکل ہو گیا ہے تو دوسری جانب کشمیر کی حقیقت کو پیش نہیں کر سکتے۔ اتنے مخدوش حالات کے باوجود ایڈیٹر صورت حال کو نارمل بتانے پر زور دیتے ہیں۔ دفتر سے ہدایات آتی ہیں کہ کیا لکھنا، کیا نہیں لکھنا۔"

https://www.dw.com/ur/a-۵۱۶۱۲۷۶۸ dated ۱۰th Dec. ۲۰۱۹

مائیں۔ کشمیر پر مسلسل پابندی کے بعد اور مزید کس دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ بھارتی حکومت بدترین جبر و استحصال کے ستر سالوں کے باوجود بھی کشمیریوں کا فیصلہ تبدیل نہیں کر سکی۔ انٹرنیٹ پر پابندی کا اس کے سوا کیا مطلب ہے کہ مودی سرکار اپنے کشمیری مظالم پر دنیا کو لاعلم اور بے خبر رکھنا چاہتی ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے شہری ۱۴ اگست کو یوم آزادی منا کر ہمیشہ سے پاکستان کے ساتھ اپنے تعلق کو واضح کرتے رہے ہیں۔

کشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت کے خاتمے سے متعلق بھارتی فیصلے پر عمل درآمد کرتے ہوئے جموں و کشمیر کو دو مختلف خطوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ صدر رام ناتھ کووند کے آرٹیکل ۳۷۰ ختم کرنے کے حکم نامے پر دستخط کرنے کے بعد مقبوضہ کشمیر کی خصوصی حیثیت ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۹ء کو ختم ہو گئی ہے۔ ایک حصہ جموں و کشمیر جب کہ دوسرا بدھ مت کے پیروکاروں کی اکثریت والا لداخ قرار پایا ہے۔ ان دونوں کا انتظام نئی دہلی کی وفاقی حکومت کے ذمے کر دیا گیا ہے۔ جموں اور وادی کے لیے گریش چندر مرمو کو اور لداخ کے لیے آر کے ماتھر کو گورنر مقرر کیا ہے۔ بھارتی حکومت اس علاقے میں تمام ہندوستانیوں کو جائیداد کی خرید و فروخت کی اجازت دے کر، ایک طرف کشمیری مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں بدلنا چاہتی ہے اور وہاں اقتصادی ترقی کی رفتار بڑھانے اور ملازمت کے مواقع پیدا کرنے کے مغالطے دیتی ہے، تاکہ کشمیر میں دہائیوں سے جاری تحریک آزادی کسی طرح کمزور پڑ جائے۔

کشمیر کے مرکزی شہر سری نگر میں سڑکیں وغیرہ مسلسل ویران ہیں۔ مقامی افراد نے احتجاجاً دکانیں بھی بند رکھی ہوئی ہیں۔ کسی ممکنہ ناخوشگوار واقعے سے نمٹنے کے لیے پولیس اور فوج کی بھاری نفری تعینات ہے۔ تاہم سری نگر سے پتھراؤ کرنے کے بیس واقعات کی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں۔[1]

جنوری کے وسط میں بھارتی سپریم کورٹ کے تین ججز پر مشتمل بنچ نے انٹرنیٹ پر مستقل پابندی کو بنیادی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے، پابندیوں کے متعلق فیصلہ سنایا:

> "انٹرنیٹ کو اظہار کی آزادی کے بنیادی حقوق کا حصہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ انٹرنیٹ پر غیر معینہ مدت کی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ دفعہ ۱۴۴ کے تحت مظاہروں اور جلسے جلوسوں پر پابندی کا ذکر کرتے ہوئے کہا اس کا نفاذ جمہوری حقوق کو دبانے کے لیے نہیں کیا جانا چاہیے۔۔ عوام کو حکومت سے اختلاف کے پر امن اظہار سے نہیں روکا جا سکتا۔"[2]

---

۱ روزنامہ نوائے وقت: ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۹

تاریخی تناظر اور اقوامِ متحدہ

① **کشمیر اور قادیانی سازش:** مسئلہ کشمیر دراصل اس قادیانی سازش کا نتیجہ ہے جب تقسیم برصغیر کے وقت ۱۹۴۷ء میں سر ظفر اللہ قادیانی نے قادیان کے ضلع گورداسپور کو قادیانی سٹیٹ قرار دلوانے کے لئے انگریز سامراج سے سازباز کی۔ تقسیم کے فارمولے کے مطابق مسلمان خطے اور ریاستیں پاکستان کے ساتھ الحاق کر سکتے تھے۔ لیکن قادیانیوں نے اپنے آپ کو غیر مسلم قرار دے کر پاکستان کے ساتھ ملنے سے انکار کیا تو کشمیر کا مسئلہ پیدا ہوا۔ پھر گورداسپور تو قادیانیوں کو نہ ملا لیکن بھارت زمینی طور پر کشمیر سے منسلک ہو گیا اور کشمیر ایک سلگتا مسئلہ بن گیا۔ ثابت ہوا کہ قادیانی اسلام اور پاکستان کے بدترین دشمن ہیں۔[1]

② **اقوام متحدہ کی ضمانت:** کشمیر تقسیم پاکستان کا نامکمل ایجنڈا ہے، حالیہ بھارتی یک طرفہ اقدامات کے بعد کشمیر کا مسئلہ ۱۹۴۸ء کے مقام پر واپس چلا گیا ہے، جہاں اقوام متحدہ نے اسے اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ اقوام متحدہ کے کشمیر پر کردار کا جائزہ لیں تو درج ذیل عجب تضادات سامنے آتے ہیں:

جنوری ۱۹۴۸ء میں جب پاکستانی فوج کشمیر میں کامیابی کے قریب پہنچ چکی تھی تو بھارتی وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کے مطالبے پر اقوام متحدہ نے مداخلت کی اور مسئلہ کے تینوں فریقوں کو ایک ایک ہدایت کی:

"اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی جانب سے ۲۱ر اپریل ۱۹۴۸ء کو ایک قرارداد نمبر ۴۷ منظور کی گئی جس میں اس مسئلے کے حل کے لیے تین مرحلہ وار نکات تجویز کیے گئے:

۱. پاکستان کشمیر سے اپنے تمام شہری [یعنی فوجی اور سول افراد] واپس بلوائے۔
۲. انڈیا کشمیر میں صرف اتنی فوج رکھے جو کہ امن وامان کے قیام کے لیے ضروری ہو۔
۳. انڈیا اقوامِ متحدہ کا نامزد کردہ رائے شماری کمشنر تعینات کرے جو ریاست میں غیر جانبدار رائے شماری کروائے۔"[2]

یعنی اقوام متحدہ نے پاکستانی فوج، قبائلیوں اور سول افراد کو فوری طور پر کشمیر سے نکل جانے کا حکم دے کر کشمیر کو بھارتی فوج کے زیر انتظام دے دیا، اور ووٹنگ کمشنر مقرر کرنے کی ذمہ داری لیتے ہوئے قرار دیا کہ کشمیر کا فیصلہ یہاں کے عوام کی استصوابِ رائے سے ہوگا۔[3]

---

1 واقعے کی تفصیل کے لئے: ۱۹۷۴ء میں ہونے والی قومی اسمبلی میں قادیانی مسئلہ پر بحث کی مصدقہ رپورٹ 'از مولانا اللہ وسایا

2 https://www.bbc.com/urdu/regional-۴۹۲۳۲۰۴۳

3 https://en.wikipedia.org/wiki/United_Nations_Security_Council_Resolution_47

③ اقوام متحدہ نے پھر اس مسئلہ کو سنجیدگی سے لینے کی بجائے، اپنے اقدامات کے اس باب ششم میں ڈال دیا، جس پر کوئی جارحانہ اقدام کرنے کی بجائے، صرف وعظ و نصیحت اور تلقین و سفارش سے ہی کام لیا جاتا ہے۔ معروف صحافی وسعت اللہ خان لکھتے ہیں:

''کشمیر کے بارے میں سلامتی کونسل کی تمام قراردادیں اقوام متحدہ چارٹر کے باب ششم کے تحت منظور کی گئی ہیں۔ ان کی نوعیت محض اخلاقی و سفارشی ہے۔ اگر کوئی فریق ان قراردادوں پر عمل نہیں کرتا تو اس کے خلاف اقوام متحدہ کوئی ٹھوس تادیبی کارروائی نہیں کر سکتا۔ اسرائیل کے خلاف منظور کی جانے والی قراردادوں کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے۔

اگر یہی قراردادیں اقوام متحدہ چارٹر کے باب ہفتم کے تحت منظور ہوتیں تو پھر ان پر عمل درآمد کے لئے سیکورٹی کونسل رکن ممالک کو اقتصادی و عسکری طاقت کے استعمال کا حکم بھی دے سکتی تھی۔ جیسا کہ سنہ ۱۹۵۰ کی جنگِ کوریا اور پھر کویت پر سے عراقی قبضہ چھڑوانے والی قراردادوں کے نتیجے میں ہوا۔''[1]

ان قراردادوں کو باب ہفتم کی بجائے باب ششم کے تحت منظور اور درج کرنا بھی اقوام متحدہ کی انتظامی جانب داری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

④ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پچاس برس بعد ۱۶/ اگست ۲۰۱۹ء کو مسئلہ کشمیر زیر بحث آیا، جس کا اجلاس بھی باقاعدہ ہونے کی بجائے ایک غیر رسمی بند کمرے کی مشاورتی میٹنگ پر مشتمل تھا۔ اس سے اقوام متحدہ کی اپنے فرائض سے غفلت اور انسانی حقوق کے محض رسمی سیاسی نعرے کا علم ہوتا ہے۔

⑤ **اقوام متحدہ کا اپنے فرائض سے انحراف:** عرصہ دراز سے بھارت ناجائز طور پر کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دیتا رہا، کشمیر پر اپنے تسلط کو قائم کرنے کے لئے اپنی فوج کی تعداد بڑھاتا رہا، حالانکہ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۷۴ میں انڈیا کو صرف اتنی فوج رکھنے کا پابند کیا گیا تھا جو صرف امن وامان کی صورتحال کنٹرول رکھ سکے جبکہ غیر قانونی طور پر انڈین فوج کی کشمیر میں تعینات فوج ۶ لاکھ سے زیادہ رہی، جس کی تعداد ان دنوں ۹ لاکھ سے متجاوز ہے۔

ایسی صورت حال میں اقوام متحدہ پر لازم تھا کہ وہ بھارتی حکومت کو اپنے اٹوٹ انگ کے دعووں سے باز رہنے کی ہدایت کرتا، کیونکہ کشمیر کی حیثیت اس کے زیر انتظام علاقے سے زیادہ نہیں ہے جس کو اقوام متحدہ

1 https://www.bbc.com/urdu/pakistan-49386958

نے ہی اس کے حوالے کیا تھا۔ پھر اس آرٹیکل ۳۷۰ اور ۳۵/اے کو بھارتی دستور سے ختم کرنے پر بھی اقوام متحدہ کو بھارت پر اس کا ناجائز قانونی اقدام واضح کرنا چاہیے تھا، لیکن سلامتی کونسل کے غیر رسمی اجلاس میں اقوام متحدہ نے اپنے مسلمہ فرائض سے کوتاہی کی۔ ایسے ہی رویے بھارت کو ڈھٹائی اور سینہ زوری کرنے پر اُبھارتے ہیں۔

⑥ عالمی طور پر مسلمہ حق خود ارادی کے حصول کی منظم جدوجہد: اقوام متحدہ کے حالیہ واقعاتی کردار اور اپنے حاصل کردہ فرائض سے واضح غفلت سے قطع نظر، اس کا ایک اصولی فریضہ ہے جو اقوام متحدہ کے عالمی منشور انسانیت UNHR میں مندرج ہے کہ

"آرٹیکل ۲۱:(۱) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کئے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(۳) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے۔ اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مساوی کسی دوسرے آزادانہ طریق رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔"

اس آرٹیکل کی رو سے ہر خطے کے عوام کو اپنا حاکم چننے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ بغیر کسی تاریخی پس منظر اور ذمہ داری کے بھی، یہ اقوام متحدہ کا اپنا مستقل آئینی فریضہ ہے کہ وہ کشمیریوں کو یہ حق دلوانے کی مضبوط جدوجہد کرے۔ جیسا کہ اقوام متحدہ نے ۲۰۰۲ء میں مشرقی تیمور اور ۲۰۱۱ء میں جنوبی سوڈان میں اپنے اسی آئینی کردار کو فوری طور پر ادا کیا، جب وہاں عیسائیوں کی حق رائے دہی کا مسئلہ تھا، اور دو اسلامی ممالک انڈونیشیا اور سوڈان کو تقسیم کر کے رکھ دیا۔ وہاں نہ تو کشمیر کی طرح، اقوام متحدہ کی پہلے سے کسی ضمانت پر کوئی فوج باہر بھیجی گئی تھی، نہ کوئی معاہدہ ہوا تھا۔ اور نہ ہی اس اقدام کو باب ششم میں رکھنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔

حق خود ارادی پر مشتمل اقوام متحدہ کے اس قانون سے دنیا کی مختلف اقوام فائدہ اُٹھاتی ہیں، لیکن جب بات کشمیر یا مسلمانوں کی ہو تو عالمی اداروں کو چپ سادھ جاتی ہے۔ ابھی ۲۳/نومبر ۲۰۱۹ء کو آسٹریلیا کے قریبی ملک پاپوانیوگنی کے ایک ۱۰ ہزار مربع کلومیٹر پر مشتمل جزیرے 'بوگن ول' پر آباد تین لاکھ انسانوں نے اپنا خود ارادی کا حق استعمال کرتے ہوئے عالمی طاقتوں: امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جاپان کی فنڈنگ سے ریفرنڈم منعقد کیا ہے۔ جس کے بعد عنقریب ریفرنڈم کے نتائج کی روشنی میں اس چھوٹے سے ملک کو پاپوانیوگنی سے

آزادی مل جانے پر بوگین ول سونے اور کانی کی معدنیات سے مالا مال، مسیحی اکثریت پر مشتمل ہے۔[1]

انڈیا بھر میں پھیلتا احتجاج: انڈیا میں 'نیشنل رجسٹر آف سٹیزنز' NRC کے بعد ۱۲ر دسمبر ۲۰۱۹ء کو جاری ہونے والے شہریت کے ترمیمی قانون 'CAA' سے ملک بھر میں بڑے پیمانے پر فسادات کا آغاز ہو گیا ہے۔ دو درجن سے زائد مسلمانوں کی شہادت اور ۲۰۰ سے زیادہ زخمیوں کے بعد انڈیا کے مسلمان شدید بے اعتمادی اور بے چینی کا شکار ہو گئے ہیں۔

۱۵ر دسمبر ۲۰۱۹ء کو جامعہ ملیہ، دہلی سے شروع ہونے والی عوامی تحریک کے بعد دہلی کے شاہین باغ میں دو ماہ کے دوران مظاہرین کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جس کو غالب و متعصب ہندو میڈیا مسلسل نظر انداز کر رہا ہے۔ دو صدیوں کی سرد ترین، ۳۱ دسمبر ۲۰۱۹ء کی رات کو دریائے جمنا کے کنارے لاکھوں مسلمان خواتین کے عزم کو شدید سرد ہوائی لہریں بھی متزلزل نہیں کر سکیں، کیونکہ اُنہیں مودی حکومت کے ان قوانین کو ماننے کے نتیجے میں مسلمانوں کے لئے جیل یا دربدر ٹھوکریں نظر آرہی ہیں۔ یہ وہ گھریلو خواتین ہیں جو کسی سیاسی

---

1 https://www.bbc.com/urdu/world-50516666

بھارت کا یہ ظالمانہ رویہ کشمیر سمیت دیگر ریاستوں کو بھی آزادی پر مجبور کر رہا ہے۔ منی پور نامی ریاست نے ۱۹۴۷ء میں برطانوی ہند سے آزادی کا اعلان کر دیا تھا، پر کشمیر کی طرح ۱۹۴۹ء میں بھارت نے غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ منی پور کے لوگ بھارت کے جابرانہ قوانین میں رہنے پر مجبور ہیں اور وہاں پر بھارتی فوج کو خصوصی اختیارات دیے گئے ہیں جس کے باعث ریاست میں ماورائے عدالت قتل کے واقعات عام ہیں۔ بھارتی فوج کی جانب سے منی پور میں گذشتہ ۱۰ سالوں میں ساڑھے ۴ ہزار سے زائد افراد قتل کیے جاچکے ہیں جب کہ ۱۵۰۰ سے زائد افراد غیر قانونی طور پر جیلوں میں قید ہیں۔

۲۹ر اکتوبر ۲۰۱۹ء کو منی پور کے مہاراجہ لیشمبا سانا جاؤبا کے نمائندوں نے لندن میں پریس کانفرنس کرتے ہوئے منی پور ریاست کی جلا وطن حکومت کا بھی اعلان کیا۔ منی پور کونسل یامبین بائرن اور وزیر خارجہ نریش فاج کا کہنا تھا کہ نریندر مودی کے انڈیا میں ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں، مودی کے شدت پسندانہ خیالات کی وجہ سے ان کے ساتھ رہنا ناممکن ہے۔ (https://urdu.geo.tv/latest/207364-)

☆ ایسی ہی صورت بھارت کی ایک اور ریاست ناگالینڈ کی ہے جو ۱۴ر اگست کو صرف اپنا یومِ آزادی ہی نہیں مناتے بلکہ پاکستان، کشمیریوں اور خالصتان کے عوام کی طرح بھارت کے یومِ آزادی کو یومِ سیاہ کے طور پر مناتے ہیں۔ چیئرمین 'نیشنل سوشلسٹ کونسل آف ناگالزم' (NSCN) نے ۷۳ ویں یومِ آزادی کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ناگالینڈ کے عوام اپنے آباؤ اجداد کے قومی فیصلے پر بالکل مطمئن ہیں کہ ناگالینڈ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو آزاد ہوا اور ہم ناگالینڈ کی عوام کے درمیان تقسیم کرنے والے کسی بھی بیرونی فیصلے کو تسلیم نہیں کریں گے۔

ناگالینڈ بھارت کے شمال مشرق میں واقع ایک انتہائی خوبصورت پہاڑی خطہ ہے اور یہاں کے لوگ قدیم قبائلی رسم و رواج کے مطابق اپنی زندگیاں گزارتے ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق ناگالینڈ کی ۸۸ فیصد آبادی غیر ہندو مذاہب سے تعلق رکھتی ہے جس میں سے ۶۷ فیصد عیسائی جب کہ باقی دیگر مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۵۱ میں ہونے والے ریفرنڈم کے مطابق ناگالینڈ کی ۹۹ فیصد سے بھی زائد عوام نے بھارت سے علیحدگی کے حق میں ووٹ دیا تھا لیکن اسکے باوجود بھارت نے وہاں اپنی فورسز کو بھیج کر قبضہ کر لیا تھا۔ (جیو نیوز: ۱۵ر اگست ۲۰۱۹ء)

ایجنڈے کا حصہ نہیں بلکہ ان حقیقی جذبات کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں جن سے ہندوستان کی مظلیم مسلم اکثریت دوچار ہے۔

'شہریت کے نیشنل رجسٹر' میں اندراج کے لئے مسلمانوں کو تو ضروری دستاویزات پیش کرنا لازمی ہیں، جبکہ شہریت ترمیمی ایکٹ کے ذریعے ہندو، سکھ اور عیسائی بنگلہ دیش، افغانستان اور پاکستان سے نقل مکانی کا دعویٰ کر کے، انڈین شہری ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں، اس بنا پر یہ قانون سیدھا سادا بھارتی مسلمانوں کو انڈیا سے بے دخل کرنے اور ان پر ہر دم لٹکتی تلوار کی مانند ہے، جس کے تحت دیگر مذاہب کے برعکس کسی بھی مسلمان کی شہریت کو منسوخ کیا جاسکتا ہے اور مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو اکثریت سے اقلیت میں بدلا جاسکتا ہے۔ اسی بنا پر آسام کے صوبے میں دہائیوں سے قیام پذیر ۱۹ر لاکھ مسلمانوں کو بھارتی شہریت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی اکثریت والے صوبے اُتر پردیش میں احتجاج کرنے والے مسلمانوں کے پوسٹرز بڑے پیمانے پر پھیلا کر پولیس گردی کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو بھارتی شہریت حاصل کرنے کے لئے ملک سے اپنی وفاداری کو ثابت کرنا ہوگا، یا اسلام کو خیر باد کہنا ہوگا۔

۱۹۵۵ء کے قانون شہریت میں شہریت ترمیمی بل ۲۰۱۹ء CAA کے قانونی جواز کے خلاف تین فریقوں کی اپیل کی پیروی کرنے والی سپریم کورٹ کی وکیل فوزیہ شکیل کا کہنا ہے کہ ''CAA غیر قانونی تارکین وطن کی از سر نو تعریف کرتا ہے اور تین ممالک سے آنے والے چھ مذہبی برادریوں سے تعلق رکھنے والے غیر قانونی تارکین وطن کو مستثنیٰ قرار دیتا ہے اور انھیں پانچ سال کی مدت میں شہریت دینے کی بات کہتا ہے۔''[1]

چونکہ بھارتی حکومت کا یہ قانون مسلمانوں سے واضح امتیاز پر مبنی ہے جس کی آئین میں مندرج انسانی حقوق کے آرٹیکل ۱۴، ۱۵ اور ۲۱ مخالفت کرتے ہیں، اس بنا پر ملک بھر سے اس کی مخالفت میں آوازیں بلند ہو رہی ہیں، جن کو پوری شدت سے دبایا جارہا ہے۔ احتجاج کرنے والے کشمیری اور بھارتی مسلمان ملک بھر میں قیام پاکستان کے دو قومی نظریے کے تاریخی نعرے کو دُہرا رہے ہیں: 'تیرا میرا رشتہ کیا... لا الٰہ الا اللہ'۔ مسلمانوں میں اسلامی اخوت کے اس طاقتور نعرے سے خائف ہو کر لبرل بھارتی شہری، مسلمانوں کو متحدہ قومیت پر یقین کرنے اور انسانی بنیادوں پر اپنی مدد پر اعتماد کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔

متحدہ قومیت کا یہ فریب، کانگریس کا وہی دعویٰ ہے جس کو سب سے پہلے علامہ اقبال نے بھانپ کر خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا نقشہ پیش کیا تھا، پھر قائد اعظم محمد علی جناح نے ہندوستانی صوبائی انتخابات ۱۹۳۷ء

1 https://www.bbc.com/urdu/regional-50763046

میں برصغیر میں بننے والی پہلی ہندو اکثریتی کانگریسی حکومت کے واضح جانبدارانہ رویے کے بعد دو قومی نظریے کا نعرہ بلند کیا تھا۔ جب کانگرس نے ۱۲ صوبوں میں حکومت بنا کر، اذان پر پابندی، نماز کے اوقات میں ڈھول بجانے، ہر تقریب کا آغاز بندے ماترم سے کرنے، اور گائے کے ذبیحہ پر پابندی [1] لگادی تھی۔ تب قائداعظم نے ۱۹۴۰ء میں مینارِ پاکستان پر برصغیر کے مسلمانوں کی متحدہ قوم ہونے کے نظریے کی قراردادِ لاہور پیش کی تھی۔ اس وقت بھی مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد اسی متحدہ قومیت کے نظریے کے اسیر تھے، جس پر علامہ اقبال نے سنگین الفاظ میں تنقید کی تھی:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی ست

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست

آج جس طرح کشمیر کی صورتحال ۱۹۴۸ء کے مقام پر وہیں واپس آگئی ہے، جہاں سے شروع ہوئی تھی، اور مسلمانوں کے ۷۰ سال ہندوؤں کے مظالم سہنے میں گزر گئے، اسی طرح پورے انڈیا میں متحدہ قومیت کا نظریہ بھی ایک بار پھر اپنی حقیقت طشت ازبام کرچکا ہے۔ اور قائداعظم کا دو قومی نظریہ دوبارہ موجودہ حالات میں اپنی صداقت کی گواہی دے رہا ہے۔ انڈیا کے حالات ایک نئے پاکستان بننے کی طرف جا رہے ہیں۔

کفر کے دعوے ماضی کی طرح جھوٹے ہیں، اور مسلمانوں سے ان کی نفرت کی وجہ صرف ان کا اسلامی عقیدہ ہے۔ کفر کے مقابل اسلام کی نظریاتی طاقت ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کا حقیقی تحفظ کرسکتی اور باقی دنیا کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار اور اپنی ذمہ داریوں کا شعور پیدا کرسکتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنی اصل نظریاتی طاقت سے کسی طور دستبردار ہونے کی بجائے، مختلف مخصوص علاقوں میں یکجا ہو کر، پاکستان کی طرح دو قومی نظریے کی بنا پر اپنے سیاسی حق کے لئے آواز بلند کرنا اور دنیا میں جاری نظام پر اپنے حق خود ارادی کی مسلسل دستک [2] دینا ہوگی، تاآنکہ انڈیا ان مسلمانوں کے لئے ریفرنڈم کی ووٹنگ کرانے پر مجبور ہوجائے۔ انڈیا کے مسلمانوں کو کانگرس نے مسلسل مغالطوں کا شکار کرکے آہستہ آہستہ ستر سال کے عرصہ میں اس قدر کمزور کردیا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی مسلم اقلیت ہو کر بھی اپنے بنیادی حقوق کے لئے وہ انتہا پسند ہندوؤں کے

---

1 ur.wikipedia.org/wiki/ ہندوستانی صوبائی انتخابات ۱۹۳۷ء

۲ مذاہب سے بالاتر ہو کر متحدہ قومیت کا نعرہ نرا ڈھونگ ہے اور ازل سے ابد تک چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی ستیزہ کار رہا ہے۔ وطنی ریاست کی بجائے 'نظریاتی ملت' ہی درحقیقت اسلامی تقاضا ہے۔ اور ملتِ اسلامیہ کی تشکیل اصلاً تو دعوت وجہاد کے ذریعے ہوتی ہے جبکہ حق خود ارادی کے ذریعے بھی اگر نظریاتی ملت بنتی ہو تو معلوم تاریخی حقائق کے برعکس اس کی کوشش کرلینی چاہیے۔

رحم وکرم پر ہیں۔ مسلمانوں کے ان مختلف معاشروں کو منظم ہو کر، ان مسلمان ممالک اور مسلمان تنظیموں کے ساتھ مسلسل اپنے حقوق حاصل کرنے اور انڈیا کا اصل بھیانک چہرہ دکھانے کی جدوجہد کرنی چاہیے جن کو اپنے ملک کی ترقی اور عیش وعشرت کی بلندیوں کو چھونے کے علاوہ کسی ملّی رشتے کی کوئی فکر نہیں۔

گذشتہ صدی میں تین بار جہادی معرکوں کا مرکز بننے والی، ایودھیا کی مشہور بابری مسجد کے انہدام کے سیاسی نعرے سے انڈیا بھر میں مذہبی تشدد کی داعی بی جے پی نے اپنا سیاسی تشخص حاصل کیا، پھر عملاً ۱۹۹۲ء میں مسجد کو شہید کر کے چھوڑا۔ آج مودی کی دوسری حکومت اسی ہندو مسلم کارڈ کو کھیل کر، امریکہ کی تائید سے انڈیا میں مسلمانوں کی قسمت کا حتمی فیصلہ کرنے کی بھرپور کوشش میں مصروف ہے۔

⑦ شہری حقوق کا تحفظ: عالمی منشور انسانیت کے آرٹیکل ۱۳، ۱۸ اور ۱۹ کے تحت انسانوں کے شہری، اطلاعی، آزادانہ نقل وحرکت کے حقوق کا تحفظ کرنا بھی اقوام متحدہ کا آئینی فریضہ ہے۔ لیکن اقوام عالم کی اس پر گھمبیر خاموشی معنی خیز ہے۔ گویا اپنے جانوروں تک کو حقوق دینے کا دعویٰ کرنے والا مغرب، جب مسلمانوں کے حقوق پر آتا ہے تو وہاں ان کی زبانیں کند ہو جاتی ہیں۔ عمران خان نے اقوام متحدہ سے اپنے خطاب میں بجا کہا ہے کہ اتنا طویل عرصہ اگر جانوروں کو بھی قید رکھا جاتا تو مغربی اداروں کی پھرتیاں دیدنی ہوتیں، لیکن یہ ظالم عالمی برادری مسلمانوں کو حیوانوں جتنا حق آزادی دینے کو بھی تیار نہیں۔

امریکا کے سینیٹر گیری پیٹرز نے مطالبہ کیا ہے کہ بھارت مقبوضہ کشمیر سے فوج باہر نکالے اور شہریوں کو آزادیٔ اظہار کی اجازت دے۔ اس نے یقین دہانی کرائی کہ "وہ مسئلہ پر دیگر اراکین سینیٹ سے بات کریں گے اور سینیٹ میں قرارداد پیش کی جائے گی۔"[1]

دراصل اس طرح کے امریکی مطالبے اور حکام کے دعوے ظلم کے دباؤ سے ہوا نکالنے اور خوابِ غفلت میں سلانے کی ناروا کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ تاہم ایسے بیانات سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس مسئلہ کی سنگینی کو ماننے پر غیر مسلم بھی مجبور ہیں۔ اگر یہ لوگ سنجیدہ ہوں تو کوئی امریکی سینیٹر سنکیانگ کے مسلمانوں کے انسانی حقوق کی پامالی پر، چین کی طرح بھارت پر پابندیوں کا بل کیوں امریکی کانگرس میں پیش نہیں کرتا؟

⑧ جان ومال اور تشدد سے بچاؤ کا حق: انسانوں کے جان ومال کا تحفظ اور تشدد سے بچاؤ بھی اقوام متحدہ کا فریضہ ہے۔ ۹/ اگست ۲۰۱۹ء کو سری نگر میں 'صورہ' کے مقام پر احتجاج پر بھارت فوج کی پیلٹ گن سے سیدھی فائرنگ بھی بہیمانہ ظلم وتشدد ہے۔ صورہ احتجاج کے مرکز کے طور پر سامنے آیا ہے۔ کشمیر میں خوف

1 https://urdu.arynews.tv/us-senator-will-present-bill-about-kashmir-issue

مزید اس کا یہ عالم ہے کہ سرکاری سکول کھلنے کے باوجود طلبہ سکولوں میں آنے سے گریزاں ہیں، یہ ایسے وقت میں ہے جب کہ وادی کی پوری سیاسی قیادت نظر بند ہے اور کسی طرف سے بھی احتجاج کی کال نہیں دی گئی۔ سیاسی رہنماؤں، کاروباری شخصیات اور کارکنان سمیت تقریباً ۲۵ ہزار افراد کو زیر حراست رکھا گیا ہے۔ کئی افراد کو ریاست کے باہر موجود جیلوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ چھن کر آنے والی ظلم کی چند عالمی خبروں کے مطابق، بعض کشمیریوں کا بیان ہے کہ

"انھوں نے میرے جسم کے ہر حصے پر مارا پیٹا۔ انھوں نے ہمیں لاتیں ماریں، ڈنڈوں سے مارا، بجلی کے جھٹکے دیے، تاروں سے پیٹا۔ انھوں نے ہمیں ٹانگوں کی پچھلی جانب مارا۔ جب ہم بے ہوش ہو گئے تو انھوں نے ہمیں ہوش میں لانے کے لیے بجلی کے جھٹکے دیے۔ جب انھوں نے ہمیں ڈنڈوں سے مارا اور ہم چیخے تو انھوں نے ہمارے منہ مٹی سے بھر دیے۔

جب میں نے کپڑے اتارے تو انھوں نے تقریباً دو گھنٹے تک مجھے بے رحمی سے ڈنڈوں اور سلاخوں کے ساتھ پیٹا۔ جب بے ہوش ہو گیا تو انھوں نے مجھے ہوش میں لانے کے لیے بجلی کے جھٹکے دیے۔"[1]

بعض کشمیریوں کے مطابق، بہت سے شہری ہلاک ہو گئے ہیں لیکن شہری یونینیں انہیں موت کے تصدیق نامے جاری نہیں کر رہیں۔

کشمیر میں ہونے والے ان تمام مظالم کو نظر انداز کر کے اور اپنے تمام فرائض سے منہ موڑ کر اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کا صرف یہ کہہ کر اُٹھ جانا کہ 'فریقین تشدد سے بچیں'[2] سراسر مفاد پرستی، فرائض سے انحراف اور بھارت کو کھلی چھوٹ دینا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت جو بھی کر لے، بس چیخیں بلند نہ ہونی چاہئیں۔

⑨ مذکورہ بالا نکات سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر پر باقاعدہ قرار دادوں کے علاوہ اقوام متحدہ کے 'حقوق انسانی کا چارٹر' بھی اُسے کئی اعتبار سے اُصولاً کشمیریوں کی مدد کا پابند کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۲ء کے شملہ معاہدے کی پہلی شق کی رو سے بھی ہندو پاک میں تعلقات کی مستحکم بنیاد اسی اقوام متحدہ کے چارٹر کو قرار دیا گیا[3] ہے۔ لیکن یہاں بھی اقوام متحدہ کا کردار مفاد پرستانہ اور دوغلا ہے۔ پاکستانی سفارتکار شمشاد احمد خان کے مطابق

"عمل درآمد کے پہلو پر سلامتی کونسل کو ہم محض ایک 'ڈبیٹنگ کلب' ہی سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ

---

1 https://www.bbc.com/urd

2 https://gulfnews.com/wo

3 https://en.wikipedia.org/wi

ادارہ اب ایک رسمی کارروائی کے علاوہ کچھ نہیں اور انسانی حقوق پر بھی اب ملکی مفاد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جب اقوام متحدہ بنی تھی تو اسے دنیا میں انسانیت کی بہترین امید کہا جاتا تھا لیکن اب یہ آخری بدترین سے بھی بدترین امید کہلائی جا سکتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس وقت اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کے سامنے سینکڑوں قراردادیں پڑی ہیں لیکن نتیجہ صفر ہے۔ کشمیر پر بھی قراردادیں یو این آرکائیو کا حصہ ہیں۔ ایک اور سفارتکار تسنیم اسلم کا کہنا ہے کہ انڈیا نے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرنے سے انکار کیا تو بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی جا سکے گی۔"[1]

⑩ اقوام متحدہ عالمی طاقتوں کا آلہ کار اور ان کے مفادات کی ڈھال ہے: اقوام متحدہ نے عراق کی جھوٹی جنگ ۲۰۰۳ء پر بھی امریکہ و برطانیہ کا کوئی ہاتھ نہ روکا، بلکہ صرف شور ڈالنے پر اکتفا کیا۔ جب امریکہ نے عراق پر کیمیائی ہتھیاروں کا جھوٹا الزام عائد کیا، جس کی بعد میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے وزرائے اعظم نے عراقی عوام سے باقاعدہ معافی مانگی۔ برطانیہ کی سر چلکوٹ رپورٹ نے اس مسئلہ میں ظلم و تباہی کا ذمہ دار سراسر بش حکومت کو قرار[2] دیا۔ ان مظالم کا نتیجہ ہے کہ ۲۰۰۳ء کے بعد ۱۷ سال گزر گئے اور عراق ابھی تک لاکھوں مسلمانوں کی قربانی اور شہروں کی بربادی کے ساتھ سلگ رہا ہے۔ ڈھٹائی اور سینہ زوری دیکھئے کہ جنرل قاسم سلیمانی پر ڈرون حملہ کے بعد جب امریکہ کو عراقی پارلیمنٹ نے باہر نکلنے کی قرارداد پیش کی تو امریکی صدر کا جواب تھا کہ پہلے یہاں پر لگے ہمارے اربوں ڈالر ادا کئے جائیں۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ایسے سفاکانہ اقدام پر امریکہ و برطانیہ کی نری معذرت کی بجائے، ان کو سنگین سزا دی جاتی، انہیں انسانی حقوق کا مجرم قرار دے کے عالمی ضمیر کو ان کے خلاف متحد کیا جاتا، لیکن عالمی برادری میں ایسا انصاف ہی ناپید ہے۔ اسی رویے نے نام نہاد تہذیب و تمدن کے اس دور میں دنیا کو طاقتوروں کے لئے جنت اور کمزوروں کے لئے جہنم بنا رکھا ہے۔ دور حاضر کا یہ عالمی ظلم قرون وسطی کے مظالم سے کہیں زیادہ سنگین اور بھیانک ہے۔

⑪ اقوام متحدہ نے جب مسلمانوں پر اپنے خود ساختہ انسانی حقوق عائد کرنے ہوں تو اس کی رعونت قابل دید ہوتی ہے۔ ۱۹۸۹ء میں نام نہاد دہشت گردی کے خلاف قائم ہونے والا اقوام متحدہ کا ذیلی ادارہ 'فنانشل ایکشن ٹاسک فورس' FATF کس طرح فرضی جرائم کے دعوے کر کے، پاکستانی معیشت کو دباؤ میں لاتا اور اس سے دسیوں سماجی اور سیاسی اقدام کرواتا ہے، ہر باشعور پاکستانی اس سے آگاہ ہے۔

---

۲ تفصیل کے لئے: 'عراق پر امریکی سفید

دراصل اقوام متحدہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس کو طاقتور ممالک نے اپنے بہیمانہ مفادات کے لئے خود ہی قائم کیا، اور اپنی ڈھال بنا رکھا ہے، چونکہ ویٹو کے ذریعے اقوام متحدہ کے اقدامات پر سیکورٹی کونسل میں بیٹھی چند طاقتوں کی اجارہ داری ہے۔ چنانچہ بیت المقدس میں امریکی سفارتخانے کے خلاف اقوام متحدہ کی جنرل کونسل کی بھاری اکثریت سے منظور ہونے والی قرارداد ہو، یا بھارتی شہریت کے قانون کے خلاف اکثریتی قرارداد، ایسے ہی ہر سال کئی روز تک نیویارک میں ہونے والی اقوام متحدہ کی تقاریر، جیسا کہ پاکستان کے وزیر اعظم عمران خان نے کشمیر کے بارے میں خطاب کیا، یہ سارے اقدامات صرف اخلاقی حیثیت رکھتے ہیں جن کا اقوام متحدہ کے کردار سے کوئی تعلق نہیں، جبکہ دوسری طرف جب مسلمانوں کی بات آتی ہے تو اقوام متحدہ نے پہلے کشمیر میں مزاحمت کرنے والوں کو دہشت گرد قرار دیا، پھر جماعت الدعوۃ اور مجاہدین کی دیگر تنظیموں کو مجرم بتایا، پھر اپنی فنانشل ایکشن ٹاسک فورس نے ایک طرف کشمیر میں تمام مزاحمت کو بند کر کے رکھ دیا، پھر ایسے تمام اداروں کے فنڈز منجمد کر دیے، اور اب لگاتار حکومت پاکستان کو گرے لسٹ میں رکھ کر، آئے روز نت نئے مطالبے کئے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں ہر سطح پر جاری اقلیتوں کی ناز برداریاں ہوں، یا دینی اداروں پر آئے روز کی بندشیں[1] یہ سب ای فنانشل ٹاسک فورس کا کیا دھرا ہے؟ عالمی قوانین کے اصل مجرم انڈیا پر تو اقوام متحدہ بالکل خاموش اور مجبور دکھتا ہے، اور مظلوم مسلمانوں اور پاکستان کو دبانے کے لئے اس کے ترکش میں سارے تیر موجود ہیں۔ کوئی ملک خود پیش قدمی کرے تو دہشت گرد ٹھہرے اور سیکورٹی کونسل تک رسائی کے لئے لمبی جدوجہد کرے، بمشکل اس کی آواز سنی جائے اور اس کے ایجنڈے پر آجائے تو ویٹو کا سامنا کرے!

اقوام متحدہ کے یہی دوغلے رویے دنیا میں اس کے خلاف نفرت کو پروان چڑھاتے ہیں۔ پھر بعض لوگ اس کو ظلم کے خلاف معیار قرار دیں تو ان کی دانش پر سوال اُٹھتا ہے۔ اقوام متحدہ کے انصاف کا دعویٰ اور اس سے امید کے راگ الاپنے والے جاوید غامدی جیسے مفکر ایمانی جذبہ و فراست سے عاری ہیں۔ پھر جب وہ جہاد کا معیار اقوام متحدہ کو قرار دیتے ہیں تو ان کی فکری بے چارگی اور ذہنی افلاس پر رحم آتا ہے۔

⑫ **شملہ معاہدہ پر بھی اقوام متحدہ کا چارٹر نگران ہے:** قضیہ کشمیر پر پاکستان کا اُصولی موقف بہر حال اقوام متحدہ کی قراردادوں سے زیادہ قرب رکھتا ہے، جبکہ بھارت بظاہر شملہ معاہدے (۲؍جولائی ۱۹۷۲ء) کو سامنے لاتا ہے کیونکہ شملہ معاہدہ اس موقع پر انڈین سفارتکاری کی کوشش تھی، جب پاکستانی فوج مشرقی پاکستان میں شکست کھا چکی تھی۔ شملہ معاہدہ کے متن کو دیکھا جائے تو اس میں بھی دوسری شق اقوام متحدہ کے چارٹر کو

1 مزید تفصیل کے لئے دیکھیں https://www.bbc.com/urdu/pakistan-50093108, https://www.bbc.com/urdu/pakistan-50320000

مرکزی حیثیت دیتی ہے، تاہم بھارتی سفارتکار شملہ معاہدے کا وہ مفہوم بیان کرتے ہیں جس سے ان کے موقف کی ترجمانی ہوتی ہے کہ کشمیر انڈیا اور پاکستان کا باہمی مسئلہ ہے، اس میں کسی تیسرے فریق کو نہیں ڈالا جاسکتا۔ اور اس دعوے سے پاکستانی سفارتکار متفق نہیں ہیں۔ گویا انڈیا کے پاس لے دے کر، شملہ معاہدے کی من مانی تشریح ہی ہے۔ جبکہ اقوام متحدہ کی قراردادیں پاکستانی موقف کو ہی ترجیح دیتی ہیں۔

☆ کشمیر کے بارے میں تین موقف پائے جاتے ہیں: پاکستان کے ساتھ انضمام کا، اور یہی عظیم کشمیری اکثریت کا مطالبہ ہے۔ انڈیا کے ساتھ الحاق کا، جو اتنی کمزور سی آواز ہے کہ انڈیا کو چھ ماہ بعد بھی کرفیو اُٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ اور عالمی طاقتیں کشمیر کے نام سے ایک آزاد ریاست قائم کرنے کا مطالبہ کر کے اس اہم خطے کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ تاہم کشمیر کا قضیہ چونکہ اسلام اور مسلمانوں کا معاملہ ہے، یہ تقسیم پاکستان کا نامکمل ایجنڈا ہے، اس لئے کشمیریوں کی اکثریت آزاد کشمیر کی طرح پاکستان کے ساتھ ہی انضمام چاہتی ہے جیسا کہ وہ اپنا یوم آزادی ۱۴ر اگست کو ہی مناتے ہیں اور کشمیریوں کو انڈیا کی طرف سے اسی کی سزا دی جارہی ہے۔ ان حالات میں پاکستان کا آزاد کشمیر کے شہریوں کے ساتھ جتنا بہتر رویہ ہوگا، کشمیری اتنا زیادہ پاکستان کے ساتھ انضمام پر ہی کاربند رہیں گے۔

مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کا ایک طریقہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق ہیں اور دوسرا ملتِ اسلامیہ کے جسد واحد کا نظریہ اور جہاد۔ پاکستان کے مقدمے میں ہر دو لحاظ سے قوت پائی جاتی ہے، دنیا بھر سے کشمیریوں کے انسانی حقوق کے نام پر ہمدردی سمیٹی جائے، لیکن یاد رکھیے کہ کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ ہمارا اصل تعلق علاقائی سے بڑھ کر اسلام اور ملتِ واحدہ کا ہے۔ نظریات کی یہ طاقت سب سے دیرپا اور مؤثر ہے، اور اس پر ہی ملت اسلامیہ کو متحد کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کو اپنی پوری کوشش جاری رکھنی چاہیے، کیونکہ انڈیا کے تمام اقدامات یک طرفہ ہیں، عوام سراپا احتجاج ہیں اور ملک بھر میں حالات مزید بگڑتے جارہے ہیں۔

پس چہ باید کرد؟

① امریکہ کی ثالثی نرا دھوکہ ہے: کشمیر کے مسئلہ پر امریکی صدر اب تک چار بار ثالثی کی پیشکش کر چکے ہیں، جسے انڈیا فریقین کا باہمی مسئلہ قرار دے کر ٹھکراتا آیا ہے۔ امریکی کانگریس میں بھی کشمیر پر پابندی اور صحافیوں کو جانے کی آزادی کا مطالبہ دہرایا جاچکا ہے۔ تاہم امریکہ سے کسی خیر کی اُمید رکھنا سراسر دھوکہ کھانا ہے۔ امریکہ کی ثالثی کی دعوت اُسی گریٹ گیم کا حصہ ہے کہ پہلے پاکستان سے کشمیر کی حمایت کے بدلے میں افغانستان میں مدد لی جائے۔ امریکہ کی طرف سے پاکستان کی حمایت ایک ڈھونگ ہے اور

بھارت کا امریکہ کو آنکھیں دکھانا ڈھونگ ہے۔ آخر امریکہ کشمیر کو آزاد خطہ ہی قرار دے گا جس کے تحفظ اور انتظامی مفادات بھارت کے ساتھ منسلک ہوں گے۔ کیونکہ افغانستان کے بعد اس خطے میں امریکہ کو ایسے اڈے قائم کرنے کے لئے ایک آزاد علاقے کی از حد ضرورت ہے۔ لداخ کے نام سے مقبوضہ کشمیر کو علیحدہ کرنے، بھارت پہلے ہی امریکہ کو فوجی اڈے دینے پر حامی بھر چکا ہے اور ڈونلڈ ٹرمپ گذشتہ دنوں کہہ چکا ہے کہ ٹرمپ کی شکل میں وائٹ ہاؤس میں ہندوؤں اور ہندوستان کا بہترین دوست موجود ہے۔ چنانچہ اپنے دوست مودی کی طرف سے پیش کئے گئے لداخ میں اپنے اڈے قائم کرکے، امریکہ ایک طرف چین کو ستائے گا تو دوسری طرف سی پیک کے پاکستانی منصوبے کو ملیامیٹ کرے گا۔ پاکستان کو امریکہ سے کسی خیر کی اُمید رکھنا ہی خوش فہمی ہے کیونکہ امریکہ کا مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام سے دیرینہ سفاکانہ اور ظالمانہ کردار اسی کا آئینہ دار ہے۔ فلسطین میں ثالثی کا نتیجہ بالکل ظاہر ہے۔

② بھارتی مسلمانوں پر مظالم سراسر پاکستان کی کمزوری کا شاخسانہ ہے کشمیر اور بھارتی مسلمانوں کی طاقت مضبوط اور پر اعتماد پاکستان میں ہے۔ جب پاکستان کمزور ہو گیا تو کشمیری اور بھارتی مسلمانوں کا کوئی چارہ گر نہ رہا۔ موجودہ حالات میں بھارت کی طرف سے کشمیر کا یک طرفہ فیصلہ کر دینا دراصل آئی ایم ایف کی قسطوں کی قیمت ہے۔ پاکستان داخلی سیاست کی بھینٹ چڑھا ہوا ہے اور آئی ایم ایف کی مسلسل قسطوں کی وجہ سے پاکستان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ کشمیر کے موجودہ حالات چین کا ساتھ چھوڑ کر اور سی پیک سے نکل کر عالمی برادری کے چنگل میں پھنسنے اور جماعۃ الدعوۃ پر پابندی کا سیدھا سادا نتیجہ ہیں۔ یہ یہود و ہنود کا گٹھ جوڑ ہے، ہنود نے اقدام کیا اور یہود نے سلامتی کونسل میں اسے تحفظ دیا۔ قرآن کی گواہی سچی ہے:

﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا﴾ (المائدۃ:۸۲)

"اے نبی! آپ بلاشبہ ضرور ایسے لوگوں کو ایمان والوں کا بدترین دشمن پائیں گے، جو یہودی ہوئے اور جنہوں نے شرک کا راستہ اختیار کیا۔"

ہنود جو بتوں کے پجاری مشرک ہیں یعنی انڈیا، اور یہود یعنی اسرائیل، دونوں کی دوستی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اور جب عالمی طاقتیں اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کے ذریعے ظلم کے خلاف آواز بلند نہ کرکے، ان کی مدد کو آن موجود ہوتی ہیں، تو وہاں بھی یہودیوں کی وہی مسلمانوں سے نفرت اور قوت کار فرما ہے، جو معیشت وسیاست کے میدانوں میں مسلسل جدوجہد کے بعد اُنہوں نے عیسائی دنیا اور عالمی اداروں کو اپنا ذہنی، فکری اور سیاسی غلام بنا کر اُنہوں نے حاصل کی ہے۔

جب کشمیر کا مسئلہ جنوبی ایشیا کی سیاست کا محور ہے۔ بھارت کو یہود کی پوری آشیر باد حاصل ہے۔ عالمی طاقتوں کے گٹھ جوڑ نے اس کو حل کرنے کی بجائے مزید گھمبیر کر دیا ہے۔ اور پاکستان کے لئے کشمیر صرف مسلمانوں کے حقوق اور ان کے حق رائے دہی کے علاوہ اس کی قومی بقا کا بھی مسئلہ ہے کہ ہمارے موسم اور دریا فطری طور پر کشمیر سے ہی آتے ہیں، کشمیر بلاشبہ پاکستان کی شاہ رگ ہے۔ تو پاکستان کے لئے ملی اور قومی تقاضوں کی بنا پر کشمیر کو انڈیا کے قبضہ سے آزاد کرائے بنا کوئی چارہ نہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کی موجودہ حکومت چھ ماہ کے طویل عرصے میں اس مسئلہ پر بیان بازی سے آگے بڑھ کر کسی حکومت کے سنجیدہ اقدام اور حمایت میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اقوام متحدہ کے غیر رسمی سیشن ۱۶ر اگست میں کشمیر کے بارے میں کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکی، اور وزیر اعظم کی اقوام متحدہ میں تقریر محض بیان بازی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اب حکومت ستمبر ۲۰۲۰ء کے انتظار کی تلقین کر رہی ہے۔

③ جہاد میں ہی اُمت کی بقا ہے: کشمیر کی آزادی کے لئے دوبارہ پاکستانی قوم کو اسی جہاد کی طرف جانا ہوگا، جس کا راستہ اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں بند کیا تھا۔ دو ایٹمی طاقتوں کے درمیان کشمیر جیسا سلگتا مسئلہ اس خطے کے امن و امان کے لئے خطرہ ہے۔ ایسے حالات میں ہر مسلمان اور پاکستانی کو کشمیریوں کے حق میں دعا اور اپنے ہر ممکنہ کردار کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

افسوس کہ ان حالات میں جہاد کی عظیم طاقت کی ایمانی روح ختم کرنے والے غامدی مفکر، اُمت کو اسی اقوام متحدہ کی طرف لوٹنے کی ترغیب دے کر فکری اور نظریاتی بحران پیدا کر رہے ہیں۔ ع

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب　　اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں!

اسلام کی رو سے جب بھی ملتِ اسلامیہ پر کسی خطے میں ظلم ہو، تو ان سے قریب سے قریب تر، اور زیادہ سے زیادہ امکان رکھنے والوں پر اس ملی ظلم کے خاتمے کے لئے جہاد کرنا واجب اور فرض عین ہو جاتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ جہاد کی صورتیں بیان کر کے ان کے احکام واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَأَمَّا إِذَا أَرَادَ الْعَدُوُّ الْهُجُومَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ، فَإِنَّهُ يَصِيرُ دَفْعُهُ وَاجِبًا عَلَى الْمَقْصُودِينَ كُلِّهِمْ، وَعَلَى غَيْرِ الْمَقْصُودِينَ، لِإِعَانَتِهِمْ، كَمَا قَالَ اللهُ تَعَالَى: ﴿وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ﴾ [الأنفال:٧٢] . وَكَمَا أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بنصر المسلم، وسواء كان الرَّجُلُ مِنَ الْمُرْتَزِقَةِ لِلْقِتَالِ أَوْ لَمْ يَكُنْ. وَهَذَا يَجِبُ بِحَسَبِ الْإِمْكَانِ عَلَى كُلِّ أَحَدٍ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ، مَعَ الْقِلَّةِ وَالْكَثْرَةِ، وَالْمَشْيِ

والركوب، كما كان المسلمون لما قصدهم العدو عام الخندق لم يأذن الله في ترك لأحد. كما أذن في ترك الجهاد ابتداء لطلب العدو، الذي قسمهم فيه إلى قاعد وخارج بل ذم الذين يستأذنون النبي ﷺ ﴿يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا﴾ [الأحزاب ١٣] فهذا دفع عن الدين والحرمة والأنفس، وهو قتال اضطرار، وذلك قتال اختيار، للزيادة في الدين وإعلائه، ولإرهاب العدو، كغزاة تبوك ونحوها[1]

''جب بھی دشمن مسلمانوں پر اقدام کرے تو براہِ راست نشانہ بننے والوں پر اس کا دفاع کرنا واجب ہے، اور جو مسلمان نشانہ نہیں بنے، اُن پر لازم ہے کہ ان کی مدد کریں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ 'اگر وہ تم سے دین میں مدد مانگیں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازمی ہے، سوائے ایسی صورت کے، کہ تمہارے اور اس قوم کے درمیاں کوئی پہلے سے معاہدہ موجود ہو۔' اور ایسے مسلمانوں کی مدد کرنے کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ہر مسلمان کی مدد کرنے کا حکم بھی ہے۔ اور اس میں بھی کوئی فرق نہیں کہ ایسے دفاعی جہاد میں مسلمانوں کے پاس جہاد کا سامان ہو بھی یا نہیں۔ اور یہ جہاد ہر مسلمان پر اس کی ذات اور مال کے لحاظ سے فرضِ عین ہے۔ وہ قلیل ہوں یا زیادہ، پیادہ ہوں یا سوار۔ جیسا کہ جب مسلمانوں پر دشمن نے غزوہ خندق میں اقدام کیا تو اللہ تعالیٰ نے کسی کو اجازت نہیں دی، بر خلاف ایسے اقدامی جہاد کے جس میں خود دشمن کا سامنا کیا جاتا ہے اور اُسی جہاد اقدامی کو اللہ تعالیٰ نے قاعد اور مجاہد میں تقسیم کر کے فضیلت کو بیان کیا ہے۔ دفاعی جہاد میں جو لوگ نبی کریم ﷺ سے اجازت مانگتے تھے، تو قرآن کریم نے ان کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ وہ کہتے ہیں: ہمارے گھر خالی ہیں، حالانکہ گھروں کے خالی ہونے کی بات فضول ہے، وہ تو صرف جہاد سے جان بچانے کے بہانے بناتے ہیں۔ چنانچہ دفاعی جہاد دین، مسلمانوں کی جانوں اور ان کی عزتوں کے دفاع کا جہاد ہے، اور یہ مجبوری کا جہاد ہے۔ جبکہ دوسرا اقدامی جہاد، دین کی کثرت، کلمۃ اللہ کی سربلندی اور دشمن کو بھگانے کا جہاد ہے، جیسا کہ غزوہ تبوک وغیرہ میں ہوا تھا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دفاعی جہاد کے احکام اقدامی جہاد سے مختلف ہیں، اور اس کے آغاز کرنے میں ہمارا اختیار نہیں، بلکہ جب مسلمانوں پر ظلم وزیادتی ہوئی تو باقی مسلمانوں پر ان کی مدد کرنا ضروری ہے، چاہے ان کی تیاری ہو یا نہیں؟ وہ کم ہوں یا زیادہ، اُنہیں ہر صورت میں اپنی اپنی ہر صلاحیت کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں

---

1 السیاسۃ الشرعیۃ از ابن تیمیہ: ص ۱۰۳، الریاض ۱۴۱۸ھ

کے شانہ بشانہ کھڑے ہونا ہے تاکہ ملتِ اسلامیہ جسد واحد بن کر، دشمن کے سامنے کھڑی نظر آئے۔

④ جہاد عالمی معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ ہمارا اقوام متحدہ سے سرحدوں کی پاسداری کا معاہدہ ہے، اور ایسا ہی معاہدہ انڈیا کے ساتھ بھی ہے، اور قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں بھی معاہدوں کی پاسداری کی بات کی گئی ہے۔ تو ایسی صورت میں پہلے پاکستانیوں اور پھر ملتِ اسلامیہ پر ان عالمی سرحدوں کی پاسداری کرنا شرعاً ضروری ہے۔ معاہدوں کے سلسلے میں ہمیں سیرتِ نبویہ سے رہنمائی ملتی ہے کہ یہود مدینہ نے جب دفاعی معاہدوں کی خلاف ورزی کی تو نبی کریم ﷺ نے بھی ان کو ۵ ہجری میں جلاوطن کر دیا... قرآن کریم کی رہنمائی اس سلسلے میں بڑی واضح ہے:

﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴿٥٨﴾﴾

"اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت (عہد شکنی) کا خطرہ ہو تو برابری کی سطح پر ان کا معاہدہ ان کے آگے پھینک دو۔ کیونکہ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" (دیکھیں تیسیر القرآن زیر آیت الانفال:۵۸)

پھر دیکھیے کہ صلح حدیبیہ ۶ھ کے اہم ترین معاہدے کے بعد فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے کیسے معاہدوں کی پاسداری کی؟ صلح حدیبیہ کی رو سے مسلمان بنو خزاعہ کے حلیف ہوئے اور قریش بنو بکر کے۔ بعد ازاں شعبان ۸ھ میں قریش نے مکہ مکرمہ میں بنو بکر کے ظلم و قتل کے جواب میں نہ تو حرم کا پاس کیا اور نہ ہی معاہدے کی رو سے اپنے زیر سایہ بلکہ اپنی مدد سے ہونے والے بنو خزاعہ کے قتل کا خون بہا دینے پر آمادہ ہوئے تو عمرو بن سالم خزاعی نے مدینہ پہنچ کر نبی کریم ﷺ سے مدد کی فریاد کی، اور انہیں ان کا معاہدہ یاد دلایا۔ نامور سیرت نگار مولانا صفی الرحمن مبارکپوری لکھتے ہیں:

"قریش اور اس کے حلیفوں نے جو کچھ کیا، وہ کھلی ہوئی بدعہدی اور صریح پیمان شکنی تھی، جس کی کوئی وجہ جواز نہ تھی... قریش نے ابوسفیان کو تجدید معاہدہ کے لئے بھیجا، مدینہ سے واپس پہنچ کر ابوسفیان نے قریش کو یہ رپورٹ دی کہ میں محمد کے پاس گیا، تو انہوں نے کوئی جواب نہ دیا، ابوبکر کے پاس گیا تو کوئی بھلائی نہ ملی، عمر بن خطاب کے پاس گیا تو سب سے سخت پایا، پھر علی کے پاس گیا تو انہوں نے نرم ترین بات کی۔ پھر نبی کریم نے رمضان ۸ھ میں فتح مکہ کے لئے لشکر کی قیادت کی۔" مختصراً[1]

قرآن کریم اور سیرت النبی ﷺ کے ان واقعات سے علم ہوتا ہے کہ جب دشمن معاہدوں کا پاس نہ کرے تو مسلمانوں پر بھی معاہدوں کی پاسداری لازمی نہیں۔ کشمیر سے پاکستانی فوج اور شہریوں کا اخراج ۱۹۴۸ء میں

---

[1] الرحیق المختوم از مولانا صفی الرحمن مبارک پوری: ص ۵۳۰، ۵۳۸، مکتبہ سلفیہ، لاہور

اقوام متحدہ کے معاہدوں کا نتیجہ ہے۔ اس نے انڈیا کو کشمیر پر عارضی فوجی کنٹرول دیا تھا۔ جب اقوام متحدہ کو اپنی مسلمہ ذمہ داریوں اور عالمی معاہدات کا کوئی پاس نہیں، اور انڈیا بھی اپنے دستور میں مذکور معاہدات سے منحرف ہوکر طاقت کی زبان بول رہا ہے، تو ہر ایسے عالمی اور علاقائی معاہدوں کی پابندی مسلمانوں پر بھی لازمی نہیں رہی۔ موجودہ عالمی قانون کی رو سے پاکستان کو اقوام متحدہ سے رجوع کرنا چاہیے لیکن وہاں تو اپنے فرائض کا کوئی احساس اور مسلمانوں کی کوئی شنوائی نہیں جس کی تفصیلات پیچھے گزریں، تو اس پر انحصار اور اعتماد کیسا؟

بالفرض شملہ معاہدہ ۱۹۷۲ء کی رو سے کشمیر کا مسئلہ دو طرفہ طور پر حل کیا جانا چاہیے تھا، توجب انڈیا نے یکطرفہ طور پر آئینی دہشت گردی کی، تو اس طرح وہ اپنے معاہدے سے منحرف ہو گیا اور شملہ معاہدہ کی بھی کوئی حیثیت باقی نہ رہی، جیسا کہ پاکستان کے حالیہ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی بھی لگاتار یہی بات کہہ رہے ہیں۔ اب کشمیر کا معاملہ سیدھا سادا طاقت کا کھیل ہے، جیسا کہ نئے بھارتی آرمی چیف نے بھی آزاد کشمیر کو حاصل کرنے کی دھمکی لگا دی ہے۔ اس کے لئے ملت اسلامیہ میں ضروری لابنگ اور منصوبہ بندی کرکے، پاکستانی حکومت کو کشمیری مسلمانوں کو مظالم سے تحفظ اور دفاع کو یقینی بنانے کے لئے اقوام متحدہ پر مزید انحصار کی بجائے اسلامی جہاد کی طرف جانا ہی پڑے گا۔ یہی شریعت کا مطالبہ، حالات کا تقاضا اور نوشتہ دیوار ہے۔ عالمی برادری کا ڈھونگ آشکارا ہو چکا اور اقوام متحدہ کے دعووں کی قلعی کھل چکی ہے!

⑤ **وطنی مفادات کی بجائے وحدتِ اُمت ہی مسائل کا حل ہے:** اُمت مسلمہ کے زوال اور مسلمانوں پر آئے روز بڑھتے مظالم کی وجہ زبانِ رسالت سے بیان ہو چکی ہے، سید المرسلین نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«يُوشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا» فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: «بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيرٌ، وَلَكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ! وَلَيَنْزَعَنَّ اللهُ مِنْ صُدُورِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَلَيَقْذِفَنَّ اللهُ فِي قُلُوبِكُمُ الْوَهْنَ»، فَقَالَ قَائِلٌ يَا رَسُولَ اللهِ! وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ: «حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ»[1]

''ایسا وقت آنے والا ہے کہ دوسری اُمتیں تمہارے خلاف ایک دوسرے کو بلائیں گی جیسے کہ کھانے والے اپنے پیالے پر ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔'' تو کہنے والے نے کہا: کیا یہ ہماری ان دنوں قلت اور کمی کی وجہ سے ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ تم ان دنوں بہت زیادہ ہوگے، لیکن جھاگ کی طرح ہوگے جس طرح کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کے سینوں سے

---

1 سنن أبي داؤد، كِتَابُ الْمَلَاحِمِ (بَابٌ فِي تَدَاعِي الْأُمَمِ عَلَى الْإِسْلَامِ)

تمہاری ہیبت نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں وَھن ڈال دے گا۔" پوچھنے والے نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وَھن سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "دنیا کی محبت اور موت کو ناپسند کرنا۔" یعنی اپنے اپنے دنیوی مفادات کی فکر اور آخرت کو بھول جانا۔"

مسلمان اس لئے پریشان حال ہیں کہ مسلم اقوام نے مغربی نظریہ وطن پرستی کے تحت ذاتی ذاتی مفادات کے علم اُٹھا رکھے ہیں اور ملت کا پاسباں کوئی بھی نہیں۔ جس حجاز سے اسلام طلوع ہوا اور جس ملک کی بنیاد ہی کلمہ طیبہ پر اُٹھی، ان سمیت سارے مسلمان اپنے اپنے مفادات کے اسیر ہیں۔ جس طرح پاکستان کو افغانستان کی جنگ ۲۰۰۱ء میں امریکہ کی مدد کرنے، اور سنکیانگ کے مسلمانوں کے حق میں آواز اٹھانے سے چین سے وابستہ ملکی مفادات نے روک رکھا تھا، اسی طرح عرب ممالک بھی انڈیا سے اپنے اپنے وطنی مفادات کی بنا پر تعلقات بنا رہے ہیں، اور یہی ذاتی مفادات اور دنیا سے محبت اُمت کی اصل کمزوری ہے۔

نبی مکرم ﷺ نے سچ فرمایا تھا کہ دنیا کی قومیں تم پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گی، تمہاری تعداد اور وسائل بے شمار ہوں گے، لیکن تمہارا وزن سیلاب پر بہنے والے خس وخاشاک سے زیادہ نہ ہوگا۔ وجہ پوچھنے پر آپ نے جواب دیا کہ تم دنیا کی طرف لپکو گے اور آخرت کو بھلا بیٹھو گے۔

جب ہنود کو یہود کی طاقت سیکورٹی کونسل نے سپورٹ کیا، ملتِ کفر میں قدرِ مشترک اسلام دشمنی ہے تو اس کا سامنا اکیلے نہیں، صرف نظریاتی اور ملی طاقت سے ہو سکتا ہے جو افسوس کہ امت کے مقتدر افراد واداروں میں جنس نایاب ہے۔ یہی نظریاتی طاقت اصل قوت ہے، اسی کو حاصل کرنا ملت کی معراج ہے۔

مغربی اقوام کے نظریات اور ان کی محافظ اقوام متحدہ کا بنایا ہوا نظام دراصل مسائل کی جڑ ہے۔ ایک طرف جہاد کی نفی کر کے اقوام متحدہ نے حق خود ارادی (رائے عامہ) کو حکومت کی بنیاد قرار دیا، بالخصوص مسئلہ کشمیر میں تو اسی اساس پر ۱۹۴۸ء میں فیصلہ سنایا گیا، تو دوسری طرف اسی حق خود ارادی کو قائم کرنے سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ ایک لمبا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اقوام متحدہ اپنے طے شدہ فیصلوں، فرائض اور نظام سے کھلا انحراف کر رہی ہے۔ غیر مسلموں کے حقوق اور ان کی ریاست کے لئے تو اقوام متحدہ فوری حرکت میں آتی ہے، جبکہ مسلمانوں کی بات ہو، یا کفر کے بڑے مفادات پر زد پڑے تو چپ سادھ لی جاتی ہے۔ کفر کے ان دھوکوں اور مغالطوں سے امت کے فہیم عناصر کو پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے۔

کشمیر کے موجودہ حالات سے اقوام متحدہ کے قائم کردہ قومی ریاست National State/وطن پرستی کے الحادی نظریے کی حیثیت بھی کھل جاتی ہے۔ وطن پرستی کا یہ نعرہ جہاں ایک طرف حق خود ارادیت پر قائم

ہے جو کھوکھلا ہو چکا ہے تو دوسری طرف اس نے ملت اسلامیہ کے جسدِ واحد کے شرعی مطالبے کو بھی سنگین نقصان پہنچایا ہے۔ ملت کو وطنیت کے سیاسی افتراق میں مبتلا کر کے، جہاں اپنے اپنے مفادات میں اُلجھا دیا گیا ہے، وہاں جہاد کی ملی طاقت کو بھی بے معنی کر دیا گیا ہے، حق خود ارادیت دراصل جہاد کی نفی پر مبنی ہے۔

مسلمانوں کی جو طاقت بھی تحفظ وابقا کی جائز جدوجہد کرے، عالمی میڈیا کے ذریعے مسلمانوں سمیت تمام انسانوں کو کبھی دہشت گردی، کبھی شدت پسندی اور کبھی انسانی حقوق کی مخالفت کے نام پر مغالطہ کا شکار کر دیا جاتا ہے۔ اور یوں جائز مزاحمت کرنے والوں کے خلاف مسلمانوں کو ہی منظم کر دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں افغانستان میں طالبان کے خلاف ہونے والے بدترین مظالم، اس کی غلط رپورٹنگ اور طالبان کی غلط تصویر کشی، اس ابلاغی دھوکہ دہی[1] کی نمایاں مثال ہیں۔

⑥ **ملی اداروں کا قیام:** ملت کے موجودہ حالات واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ احیائے ملت اور ہمہ نوعیتی دعوت و جہاد کے سوا، مسلمانوں کے پاس کوئی چارہ کار نہیں۔ سعودی عرب کے ایران و یمن کے ساتھ مسائل ہوں، ترکی کی کردوں کے ساتھ مشکلات ہوں یا پاکستان کے لئے کشمیر، افغانستان کے مسائل۔ تمام مسلم ممالک کو آپس میں سر جوڑ کر، ملت کے ناطے اپنے مسائل کے حل کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی۔

آخری تین دہائیوں میں تمام قتل وغارت اور جنگ وجدال مسلم یا غیر مسلم ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے۔ بوسنیا، افغانستان، عراق، شام، یمن، لیبیا، چیچنیا، صومالیہ، برما، فلسطین، کشمیر، انڈیا، مصر، بنگلہ دیش، ڈنمارک، ناروے، امریکہ، چین، نیوزی لینڈ، فرانس، برطانیہ اور جرمنی وغیرہ میں مسلسل اسلام اور مسلمان ہی نشانے پر ہیں۔ پھر بھی مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہونے کو تیار نہ ہوں تو کس کو دوش دیا جائے؟

اس تمام ظالمانہ منظر نامے کو تشکیل دینے کے لئے کفر نے کم از کم ایک صدی پر محیط مسلسل جدوجہد کر کے اقوام متحدہ اور عالمی اداروں پر مشتمل ایک عالمی نظام تشکیل دیا ہے، جن کا مقابلہ بھی اکیلے اکیلے، یا کفر کی حاشیہ نوازی کی بجائے مشترکہ ملی طاقت کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔ موجودہ ریاستی مظالم ایک عالمی نظام کے بل بوتے پر جاری ہیں، ان ریاستوں کو اقوام متحدہ نے قائم اور تحفظ دے رکھا ہے۔ اور متبادل و متوازی عالمی نظام

---

[1] دو ہزار صفحات پر جاری ہونے والی واشنگٹن پوسٹ کی دستاویزات سے علم ہوا جس میں جنگ میں براہ راست شامل چھ سو افراد بشمول فوجی جرنیلوں، سفارتکاروں، امدادی کارکنوں اور افغان حکام کے غیر مطبوعہ نوٹس اور انٹرویوز شامل ہیں کہ "کس طرح امریکی حکومت نے دانستہ طور پر عوام کو گمراہ کیا ہے۔ کابل میں فوجی ہیڈ کوارٹرز اور وائٹ ہاؤس میں اعداد و شمار سے چھیڑ چھاڑ عام بات تھی۔ جس کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش ہوتی کہ جنگ جیتی جا رہی ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔"
https://www.bbc.com/urdu/world-50724263

بنائے بغیر اس کا دائمی ازالہ ممکن نہیں۔ تین چار مسلم ممالک بھی متحد ہو گئے اور اپنی طاقت کو مجتمع کر کے سیاسی، عسکری، اور مالی حقیقی اتحاد تشکیل دے لیا، فوری طور پر چین یا روس کو ساتھ ملا لیا، تو مغربی مظالم کو کہیں پناہ نہ ملے گی۔ ان سنگین ملی حالات میں سعودی اور ترکی بلاکوں کی باہمی کشمکش افسوس ناک ہے۔ آپسی الجھنوں کی بجائے تقسیم کار کے ذریعے ملی مقاصد کی طرف پیش قدمی ضروری ہے جس کے لئے درج ذیل اداروں کو تشکیل دینا اور مؤثر کرنا ہو گا:

a. عقائد و نظریات اور ان کے فروغ کا ملی فورم: جدید فقہی مسائل کے مشترکہ ملی فورمز کی طرح نظریاتی اور اعتقادی وحدت کے ملی ادارے تشکیل دیے جانے بھی بہت ضروری ہیں، جہاں سے مغربی تہذیب کے اسلام کے خلاف مسلسل نظریاتی حملوں اور نظریاتی و عملی اقدامات پر نظر رکھی جائے۔ کفر و اسلام کے متقابل و متخالف نظریات میں نکھار، اور جوابی علمی بیانیہ تشکیل دیا جائے۔ عملی فقہی مسائل سے بڑھ کر نظریاتی طور پر اتفاق کی ضرورت کو سمجھا جائے اور اس کو باطل ادیان کے ساتھ ساتھ، غالب مغربی تہذیب اور اس کے نفوذ کے طریقوں کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اس نظریاتی ملی بیانیہ کو تعلیم و ابلاغ کے ذریعے پوری اُمت کی سطح پر پھیلایا جائے۔ مغربی اقدار کے بالمقابل اسلامی اقدار کو واضح اور مسلم نظریہ حیات کو راسخ کیا جائے، کیونکہ عقائد و نظریات پر ہی قوموں کی تشکیل ہوتی ہے۔

b. ملت کی سطح پر ابلاغ کی طاقتور ایجنسی: کم از کم فوری طور پر ابلاغ رنیوز کا ایسا مؤثر مرکز را ایجنسی ہی تشکیل دی جائے جو مغربی مفادات یا مسلمانوں کے علاقائی مفاد کی ترجمانی کی بجائے حقائق کی ملت کی سطح پر درست ترجمانی کرے۔ کیونکہ اوّلاً درست معلومات ہی دراصل کسی واقعہ کی حقیقی میزان ہیں اور اس سے صحیح نوعیت کا علم ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں اقدامات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

c. سیاسی وحدت کا قیام: او آئی سی یا اس سے ملتے جلتے پلیٹ فارم کو متحرک کیا جائے۔ وطنیت اور ذاتی مفادات کو پیچھے کیا جائے، اور کسی ایک ملک کے مفاد کی بجائے مشترکہ ملی مقاصد کے لئے اسلامی ممالک کی متحدہ فوج کو تقویت دے کر، جہاد کا احیا کیا جائے۔ رابطہ عالم اسلامی کی صورت میں مسلم علما کا ایک عالمی فورم موجود ہے، او آئی سی کی شکل میں مسلم حکام کا ایک ملی فورم موجود ہے۔ ان کو علاقائی حکام، ممالک اور وطنیت کے اثرات سے نکال کر ملی وحدت کا محافظ اور امین بنایا جائے۔

جلد یا بدیر ملتِ اسلامیہ کے مسائل کا حل، نبوی تعلیمات کی طرف پلٹنے میں ہی ہے۔ اور اس کے لئے ہر میدان میں مسلسل اور مشترکہ جدوجہد از بس ضروری ہے۔ (ڈاکٹر حافظ حسن مدنی)

قادیانیت کے خلاف اسلام آباد ہائیکورٹ ۲۰۱۸ء میں پیش کردہ اہم شرعی استدلال کی تفصیل

مسلم حکومت میں غیر مسلموں پر عائد شرائط

الشروط العمریۃ : شریعت اور تاریخ کے آئینے میں

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

اسلام کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں عبادات کی طرح سماجی اطوار میں بھی ایک دوسرے کی مشابہت سے گریز کریں۔ اسلام اپنی مرضی سے کوئی بھی عقیدہ اختیار کرنے پر جبر کا تو قائل نہیں، لیکن کسی شخص کو غیر عقیدہ کے اپنے اوپر اظہار سے منع کرتا ہے کیونکہ یہ مغالطہ آرائی ہے جو دوسروں کو اُلجھن میں ڈالتی ہے۔ جو شخص جس عقیدہ کا حامل ہو، اس کی زبان کے ساتھ وجود اور عادات سے بھی واضح ہونا چاہیے کہ وہ کس مذہب یا کمیونٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں کی مشابہت کا ممنوع ہونا تو ایک معروف دینی مسئلہ ہے، جس کے بہت سے دلائل ہیں، لیکن غیر مسلموں کے لئے مسلم معاشروں میں اسلامی علامات اور مشابہت سے گریز کرنا بھی شریعت کا تقاضا ہے۔ اس سلسلے کی اہم ترین شرعی اور تاریخی دستاویز خلافتِ راشدہ میں اجماع صحابہ سے طے پانے والی 'شروط عمریہ' ہیں، جن کی بنیاد دراصل بہت سی احادیث نبویہ اور شرعی احکام ہیں۔ ان شرائط میں غیر مسلموں کو دو درجن کے قریب مشابہتوں سے روکا گیا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اس دستاویز کے کتبِ حدیث وفقہ سے متون، اس کی روایات کی تحقیق و تخریج اور اسلامی ادوار میں ان کے نفاذ کی تفصیلات کو پیش کیا گیا ہے۔

خلافت راشدہ کے آغاز میں جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زیر نگرانی بہت سے نئے مفتوحہ علاقوں میں نئے معاہدے کئے گئے۔ ان پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے رہنمائی حاصل کر کے ان کی مشاورت سے اسلامی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، شرعی مصالح کے پیش نظر بہت سے قوانین متعین کئے گئے۔ چنانچہ ۱۶ھ میں اہل شام پر اسلامی افواج جب غالب آئیں تو وہاں کے باشندوں نے اپنے طور پر بعض شرائط کی پابندی کی پیش کش کی، جس کو عساکر کے سالار سیدنا عبد الرحمن بن غنم رضی اللہ عنہ[1] نے سیدنا عمر کے

---

1 عبد الرحمن بن غنم نامور تابعین سے تھے

پاس منظوری کے لئے بھیجا۔ سیدنا عمر نے ان شرائط پر صحابہ کرام سے مشورہ کیا اور بعض شرائط میں ترمیم کے ساتھ، ان کو دوبارہ اہل شام میں بھیجا، جن ترامیم کو انہوں نے منظور کر لیا۔ ان شرائط کی منظوری میں صحابہ کرام سے پوری طرح مشاورت ہوئی اور آخر یہ شرائط اجماعِ صحابہ سے منظور ہو گئیں۔ جن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں ملتیں اپنی عادات اور شعائر میں باہمی امتیاز کو قائم کریں اور ایک دوسرے سے سماجی اختلاط سے بچنے کی کوشش کریں۔

شروطِ عمریہ اور عہدِ عمریہ

انہی سالوں میں جنگِ یرموک (۱۵ھ) کے بعد سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیت المقدس بھی تشریف لے گئے، جہاں اُنہوں نے بیت المقدس (ایلیا) کے باشندوں سے بھی معاہدہ کیا، جو عہدِ عمریہ (العهدة العمرية / العهد العمري) کہلاتا ہے[1]۔ یہ عہد عمریہ نہ صرف بیت المقدس میں جبل زیتون کی قریبی مسجد عمرؓ (كنيسة القيامة کے قریب) کے باہر آج بھی کندہ ہے، بلکہ تاریخ کی مستند کتابوں مثلاً تاریخ طبری اور تاریخ یعقوبی[2] اور البدایہ والنہایہ از حافظ ابن کثیر میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کا متن ابن بطریق اور ابن الجوزی نے بیان کیا ہے۔

عہد عمریہ اور شروط عمریہ میں فرق ہے، اوّل الذکر بیت المقدس کے باشندوں سے ہوا، جبکہ شروطِ عمریہ اہل شام کے باقی علاقوں سے ہوئیں۔

عہدِ عمریہ اور شروط عمریہ میں کوئی ٹکراؤ نہیں بلکہ عہد عمریہ میں اجمال واختصار ہے، جبکہ شروطِ عمریہ دو درجن کے قریب شرائط پر مشتمل ہیں، اور ان میں کافی تفصیل ہے۔

عہدِ عمریہ سیدنا عمر نے خود ۱۵ھ میں کیا ہے، جب بطریرک صفری نیوس نے اُنہیں چابیاں دینے کے لئے بلایا تھا۔ جبکہ شروطِ عمریہ کی پیش کش اہل شام نے سیدنا عبد الرحمٰن بن غنم کے توسط سے ۱۶ھ میں کی ہے اور مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے سیدنا عمر نے صحابہ کرام کی مشاورت سے اس میں بعض اصلاحات کر کے ان کو اہل شام کو منظوری کے لئے بھیجا ہے۔

سے مروی ہیں، اور یحییٰ بن بکیر اور امام ترمذی کا موقف ہے کہ وہ صحابی ہیں، آپ فقیہ اور اہل شام کے استاد تھے۔ (سیر اعلام النبلاء از محمد بن احمد ذہبی: ۵/۱۰ و ممن أدرك زمان النبوة، دار الحدیث قاہرہ، ۱۴۲۷ھ)

[1] عہد عمریہ کی تفصیلات کے لئے دیکھیں مقالہ: روايات العهد ةالعمرية: دراسة توثيقية از ڈاکٹر رمضان اسحاق زیان، پروفیسر شعبہ دراسات اسلامیہ، جامعہ اقصیٰ، غزہ، فلسطین

[2] محمد بن جرير طبری، تاريخ طبری: ۴۴۹/۲، دار التراث، بيروت ۱۳۸۷ هـ؛ تاريخ يعقوبي: ۱۴۷/۲؛ إسماعيل بن عمر بن كثير، أبو الفداء، البداية والنهاية: ۲۸۱/۵، دار إحياء التراث العربي، ۱۴۰۸ هـ

دونوں کی اسانید اور خصوصیات میں مزید فرق بھی ہیں۔ بعض لوگ عہد عمریہ کو تو مستند مانتے ہیں، لیکن شروط عمریہ کے ثبوت پر شبہات پیدا کرتے ہیں۔ جبکہ شروط عمریہ کا متن کتب حدیث میں آتا ہے، اور سب سے پہلا متن مسند احمد اور اس کے بعد سنن بیہقی میں موجود ہے۔ چونکہ اردو زبان میں اس بارے میں کوئی مضمون یا کتاب راقم کی نظر سے نہیں گزری، جبکہ یہ خیر القرون اور اسلامی ادوار کی ایک مستند و مسلمہ اور اہم دستاویز ہے، اس بنا پر اولین مرحلہ میں اس کے عربی متن، اس کی سندی و ترکیبی حیثیت، اور تاریخ اسلامی میں اس کے وجود کو متعدد عربی مستند کتب سے تفصیلاً پیش کیا جا رہا ہے۔

شروطِ عمریہ کی موجودہ دور میں سیاسی اہمیت و معنویت

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کے بارے میں عام طور پر میثاق مدینہ کو بنیادی دستاویز بلکہ قومی اور دائمی دستور کے طور پر بھی پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہود کے ساتھ 'معاہدہ مدینہ' کی مستند حیثیت پر اُٹھائے جانے والے اہم اعتراضات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دور نبوی ۵ھ میں ہی یہود مدینہ کو خیبر کی طرف جلاوطن کر دینے کے بعد یہ معاہدہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دور نبوی، دور خلافت راشدہ، اور چودہ صدیوں کی مسلم خلافتوں میں اس میثاق کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا، جسے مسلم دستور کا عنوان دیا گیا ہے۔

سیاسہ شرعیہ کا بنیادی سوال یہ ہے کہ اس غیر مستند اور منسوخ شدہ 'معاہدہ مدینہ' کو غیر مسلموں کے حقوق کے سلسلے میں بنیاد کی حیثیت دی جائے، یا 'شروط عمریہ' کے نام سے اس دستاویز کو غیر مسلموں کے حقوق کے سلسلے میں اصل اہمیت دی جائے جو ۱۶ھ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کے ساتھ نہ صرف نافذ ہوئیں، بلکہ اسی مضمون میں تاریخی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے کہ ۱۳ صدیوں میں ہر دور کی مسلم حکومت نے غیر مسلموں کے ساتھ انہی شرائط کو برقرار رکھا ہے۔

☆ مقالے کے آخری حصے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں کے مابین امتیاز و تشخص قائم رہنے کی حکمتوں پر بھی مفصل بات کی گئی ہے، تاہم مسلم معاشرے میں دونوں کے مابین شرعی احکام میں فرق ہونے کی بنا پر بھی شروطِ عمریہ کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ دیگر غیر مسلموں سے قطع نظر، ہمارے دور میں قادیانیت کے نمودار ہونے کے بعد ان امتیازات کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ باقی غیر مسلم تو اسلام کا دعویٰ نہیں کرتے، اور اسلامی شعائر و علامات کو استعمال نہیں کرتے جبکہ قادیانی نہ صرف اسلام کا نام، کلمہ، نبی اسلام محمد ﷺ کے نام، صحابہ و ازواج مطہرات کے القاب، بلکہ جملہ اسلامی شعائر کو اپنے مذہب کے لئے استعمال کرتے ہیں، جبکہ سید المرسلین ﷺ کے اسم گرامی 'محمد' کو بول کر اس سے مرزا قادیانی کی جھوٹی نبوت مراد لیتے ہیں۔

اس طرح وہ اسلام اور مسلمانوں میں ناجائز طور پر شامل ہونا چاہتے ہیں۔ جبکہ اُنہوں نے ختم نبوت کا انکار کر دیا تو ان کا دین اسلام کی بجائے ایک مستقل دین بن گیا ہے۔ قادیانی مسلمانوں کو کافر اور اسلام کی تمام عظمتیں ہتھیا کر اپنے آپ کو مسلمان باور کراتے ہیں۔ جب ان کے بارے میں دستور و قانون کو بھی منظور کیا جاتا ہے، اور اجماعِ اُمت سے انہیں کافر قرار دیا جاتا ہے، تب بھی اس کو تسلیم کرنے کی بجائے دھوکہ دہی سے مسلمانوں میں گھسے رہنا ہی چاہتے ہیں۔ ایسے حالات میں شروطِ عمریہ جیسی شرائط وہ شرعی بنیاد فراہم کرتی ہے، کہ قادیانی جیسے غیر مسلموں کو اسلامی شعائر استعمال کرنے سے ہر حال میں روکنا شریعت کا تقاضا ہے، جس پر صحابہ کرام کے اجماع کی بنا پر، ٹھوس شرعی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔

پاکستان میں مسلم اور غیر مسلم کے مابین اسی فرق و امتیاز کو قائم کرنے کے لئے قادیانیوں کے لئے درج ذیل اسلامی اصطلاحات کا استعمال ممنوع اور باعثِ سزا قرار پایا، چنانچہ ۱۹۸۴ء میں قانون امتناع آرڈیننس کے ذریعے مجموعہ تعزیرات پاکستان میں درج ذیل جرائم اور ان کی سزاؤں کا اضافہ کیا گیا:

"۲۹۸بی: بعض مقدس شخصیات یا مقامات کے لئے مخصوص القاب، اوصاف یا خطابات وغیرہ کا ناجائز استعمال:

(۱) قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ (جو خود کو 'احمدی' یا کسی دوسرے نام سے موسوم کرتے ہیں) کا کوئی شخص جو الفاظ کے ذریعے خواہ زبانی ہوں یا تحریری یا مرئی نقوش کے ذریعے

(الف) محمد ﷺ کے خلیفہ یا صحابی کے علاوہ کسی شخص کو امیر المومنین، خلیفۃ المومنین، خلیفۃ المسلمین، صحابی یا رضی اللہ عنہ کے طور پر منسوب کرے یا مخاطب کرے۔

(ب) حضرت محمد ﷺ کی کسی زوجہ مطہرہ کے علاوہ کسی ذات کو اُمّ المومنین کے طور پر منسوب کرے یا مخاطب کرے۔

(ج) حضرت محمد ﷺ کے خاندان (اہل بیت) کے کسی فرد کے علاوہ کسی شخص کو اہل بیت کے طور پر منسوب کرے یا مخاطب کرے یا۔

(د) اپنی عبادت گاہ کو 'مسجد' کے طور پر منسوب کرے یا موسوم کرے یا پکارے۔

تو اسے کسی ایک قسم کی سزائے قید اتنی مدت کے لئے دی جائے گی جو تین سال تک ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہو گا۔

(۲) قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ (جو خود 'احمدی' یا کسی دوسرے نام سے موسوم کرتے ہیں) کا کوئی شخص جو الفاظ کے ذریعے خواہ زبانی ہوں یا تحریری، یا مرئی نقوش کے ذریعے اپنے مذہب میں عبادت کے لئے بلانے کے طریقے یا صورت کو اذان کے طور پر منسوب کرے یا اس طرح اذان دے جس طرح

مسلمان دیتے ہیں تو اسے کسی قسم کی سزائے قید اتنی مدت کے لئے دی جائے گی جو تین سال ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا مستوجب بھی ہو گا۔

۲۹۸ سی: قادیانی گروپ، غیرہ کا شخص جو خود کو مسلمان کہے: قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ (جو خود کو 'احمدی' یا کسی دوسرے نام سے موسوم کرتے ہیں) کا کوئی شخص جو بلاواسطہ یا بالواسطہ خود کو مسلمان ظاہر کرے یا اپنے مذہب کو اسلام کے طور پر موسوم کرے یا منسوب کرے یا الفاظ کے ذریعے خواہ زبانی ہوں یا تحریری یا مرئی نقوش کے ذریعے اپنے مذہب کی تبلیغ یا تشہیر کرے یا دوسروں کو اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دے یا کسی بھی طریقے سے مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو مجروح کرے کسی ایک قسم کی سزائے قید اتنی مدت کے لئے دی جائے گی جو تین سال تک ہو سکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہو گا۔"[1]

اس دھوکہ دہی اور اسلام میں مداخلت کو روکنے کے لئے سپریم کورٹ آف پاکستان نے اپنے فیصلہ میں یہ قرار دیا کہ

"قادیانی حکمت عملی اس سوداگر کے فراڈ سے گہری مماثلت رکھتی ہے جو اپنے گھٹیا سامان کو ایک شہرت یافتہ فرم کا اعلیٰ قسم کا معروف سامان ظاہر کر کے چلتا کرتا ہے۔ قادیانی یہ تسلیم کر لیں کہ ان کی تبلیغ اسلام کے لئے نہیں بلکہ کسی اور مذہب کی طرف ہے تو بے خبر مسلمان بھی اپنے ایمان کو چھوڑ کر کفر قبول کرنے سے نفرت کریں گے، بلکہ اُلٹا قادیانیوں کے دلوں سے احمدیت کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ اگر قادیانی آئینی دفعات کی پابندی کرتے تو اس (امتناع قادیانیت) آرڈیننس کے نفاذ کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔"[2]

اور اس سے قبل لاہور ہائیکورٹ بھی اپنے فیصلے میں ایسے ہی ریمارکس دے چکا ہے۔[3]

بعد ازاں جولائی ۲۰۱۸ء میں اسلام آباد ہائی کورٹ کے محترم جسٹس شوکت عزیز صدیقی نے بھی اپنے تاریخی فیصلہ میں امتناع قادیانیت کے قانون کی مزید وضاحت کرتے ہوئے، درج ذیل اقدامات لازمی قرار[4]

---

۱ ۲۶ راپریل ۱۹۸۴ء کو صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے آرڈیننس نمبر ۲۰ 'امتناع قادیانیت آرڈیننس' جاری کیا۔

۲ فیصلہ سپریم کورٹ ۱۹۹۴ء، جسٹس عبد القدیر چودھری مرحوم۔ بحوالہ 'قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے' از محمد متین خالد، ص ۲۰۱، علم و عرفان پبلشرز لاہور، ۲۰۰۲ء

۳ فیصلہ لاہور ہائیکورٹ، پی ایل ڈی ۱۹۹۲، لاہور: ۱، بحوالہ 'قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے' از محمد متین خالد: ص ۲۰۱

۴ یاد رہے کہ اسی کیس میں بطور عدالتی معاون راقم نے شروطِ عمریہ کی تفصیلات کو عدالت عالیہ کے سامنے بطور ایک مستند شرعی بنیاد واضح کیا تھا۔ پھر مفصل فیصلہ میں جسٹس شوکت عزیز صدیقی صاحب نے کئی مقامات پر ان سے استدلال کیا ہے۔

دیے ہیں:

"اہم سرکاری رشناختی دستاویزات، اور تمام سرکاری محکموں میں تقرری سے قبل ختم نبوت کا حلف نامہ ضروری ہے۔ نیز قومی ادارہ شناخت 'نادرا' میں مذہبی کوائف میں ترمیم کو محدود کیا جائے۔ اور ریاست شہریوں کو اپنی شناخت چھپانے سے روکتے ہوئے، ایسا قانون لائے جس میں ان کا مذہبی تشخص متعین ہو سکے، کیونکہ پاکستان کے بہت سے قوانین مذہبی تشخص کی بنا پر شہری حقوق وفرائض میں امتیاز کرتے ہیں۔" مختصراً[1]

☆ پاکستان جیسے ملک میں یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے اس طرح کے امتیاز کی ضرورت شاید قدرے کم ہو، جتنی یہ ضرورت قادیانیوں کے بارے میں ہے کیونکہ عیسائی یہودی نہ تو اسلام کا نام استعمال کر کے مسلمانوں میں داخل ہونے کی کوشش کرتے اور نہ ان کے سماجی وشہری حقوق میں دخل اندازی کرتے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کو سنگین گالیاں دے کر ان کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ مسلمانوں کے شعائر وعلامات پر قبضہ جما کر ان کو منسوخ دین بتا کر اپنی مذہبی دکان چمکانا چاہتے ہیں۔ اس لئے قادیانیوں کے مغالطوں سے بچنے کے لئے یہ شروط عمریہ انتہائی اہمیت رکھتی ہیں۔

☆ شروطِ عمریہ کی مثال فی زمانہ یورپ کے اکثر ممالک میں حجاب اور مساجد کے میناروں پر لگائی جانے والی پابندی سے دی جاسکتی ہے۔ تاہم اسلام نے زیادہ متوازن اور معتدل بنیاد پر غیر مسلموں پر شرائط لاگو کی ہیں کہ غیر مسلموں کے لئے اپنے شعائر وعلامات پر عمل کرنا جائز تو ہے، لیکن مسلمانوں کے علاقے، بازار اور ایسے مقامات جہاں مغالطے کا خوف ہو، تو وہاں اس دھوکے کے احتمال کا سدباب کیا جائے۔ جب کہ اہل یورپ اس کی وجہ یوں پیش کرتے ہیں:

"ہم لوگوں کو اسکی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ کھلم کھلا اپنے ہدایت یافتہ ہونے کا اظہار کریں۔"

"مساجد کے لمبے لمبے مینار یورپ میں اسلام کی مذہبی اور سیاسی طاقت کی علامت بنتے جارہے ہیں۔"[2]

تو اہل مغرب کی یہ توجیہ، دراصل دھوکہ دہی سے بڑھ کر ان کے داخلی خوف کی غماز ہے، جو انہیں ایک ہدایت یافتہ اور کامل نظام حیات 'اسلام' سے ہمہ وقت لاحق ہے۔ نیز شروطِ عمریہ جیسے مذہبی ضوابط کا مسلمانوں کے ہاں تو جواز اور ضرورت سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اسلام سمیت تمام مذاہب نے مذہب کی بنا پر ہی معاشرے

---

۱ اسلام آباد ہائی کورٹ میں دائر رٹ پٹیشن ۳۸۶۳ کا فیصلہ مؤرخہ ۴ر جولائی ۲۰۱۸ء

۲ سابق فرانسیسی صدر شیراک نے ۲۰۰۳ء میں تیونس کے دورے میں کہا کہ "مکمل سیکولر فرانسیسی حکومت طالبات کو اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ اپنے ہدایت یافتہ ہونے کا اعلان کرتی پھریں۔ حجاب میں جارحیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔" (ماہنامہ محدث، لاہور: شمارہ اپریل ۲۰۰۴ء، ص۹) https://www.dw.com/ur/a-51481733

کی اجتماعیت کو قائم کیا اور اسی بنا پر سیاسی نظام بھی پیش کیا ہے۔ اسلام ایک نظریاتی حکومت اور معاشرت کا داعی ہے جیسا کہ دار الاسلام اور دار الحرب یا دار الکفر کی اصطلاحات اس کی غمازی کرتی ہیں۔

جبکہ اہل یورپ مذہب کو سیاست واجتماعیت میں نظر انداز کر کے، کثیر المذہبی معاشرے کے داعی ہیں۔ اہل مغرب کا سیاسی نظریہ مذہب کی بجائے وطن اور علاقہ، یعنی وطنیت کی بنا پر قائم ہوتا ہے۔ وہ معاشرے میں مذہب کی بنا پر کسی امتیاز کے قائل نہیں، بلکہ اس کے مخالف ہیں، اور تمام شہریوں را ایک وطن کے باسیوں کے برابر حقوق کے داعی ہیں۔ پھر بھی اگر وہ مذہبی امتیاز قائم کریں تو گویا اپنے سیکولرزم پر قائم نظریۂ ریاست کے برخلاف ان کا یہ اقدام، ان کی فکری اساسات سے متصادم ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر یورپی معاشروں میں مسلمانوں کے شعائر پر پابندی بلاجواز اور درحقیقت مغربی نظریات کی اپنے گھر سے شکست وریخت کے مترادف ہے۔

فہم شریعت میں سیدنا عمر بن خطابؓ کا مقام

اس موضوع پر آگے بڑھنے سے قبل یہ واضح کرنا مناسب ہے کہ سیدنا عمر فاروق کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کیا مقام تھا، ان کی سیاسی اصلاحات کی دین میں کیا حیثیت ہے اور نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں امت کو کیا ہدایت دی ہے۔

① سیدنا عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«اقْتَدُوا بِاللَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِي مِنْ أَصْحَابِي أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ»[1]

"تم ان دونوں کی پیروی کرو جو میرے اصحاب میں سے میرے بعد ہوں گے یعنی ابو بکر وعمر کی..."

امام ابن ابی العز الحنفی لکھتے ہیں:

وَتَرْتِيبُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ فِي الْفَضْلِ، كَتَرْتِيبِهِمْ فِي الْخِلَافَةِ، وَلِأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا مِنَ الْمَزِيَّةِ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَنَا بِاتِّبَاعِ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ، وَلَمْ يَأْمُرْنَا بِالِاقْتِدَاءِ فِي الْأَفْعَالِ إِلَّا بِأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ، فَقَالَ: «اقْتَدُوا بِاللَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِي: أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ»، وَفَرْقٌ بَيْنَ اتِّبَاعِ سُنَّتِهِمْ وَالِاقْتِدَاءِ بِهِمْ، فَحَالُ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ فَوْقَ حَالِ عُثْمَانَ وَعَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ ...[2]

"خلفائے راشدین کی فضیلت میں بھی وہی ترتیب ہے جو ان کی خلافت کی ترتیب (زمانی) ہے۔ اور سیدنا ابو بکر وعمر کو کچھ مزید امتیاز بھی حاصل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں خلفائے راشدین کی سنت کی

---

۱ جامع الترمذي: أَبْوَابُ الْمَنَاقِبِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ (بَابُ مَنَاقِبِ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ)، رقم ۳۸۰۵، صحیح

۲ شرح عقیدہ طحاویہ از امام ابن ابی العز حنفی: ص ۲۹۹، طبع وزارت اوقاف، الریاض، ۱۴۱۸ھ

اتباع کا حکم دیا ہے، لیکن سیدنا ابو بکر و عمر کے افعال کی اقتدا کا بھی پابند کیا ہے۔ تو فرمایا: میرے بعد آنے والے دو صحابہ کی اقتدا کرو: ابو بکر و عمر۔ اور ان کی سنت کی اتباع اور اقتدا میں فرق ہے۔ چنانچہ سیدنا ابو بکر و عمر کا سیدنا عثمان و علی سے (اقتدا و فضیلت) میں مقام بلند ہے۔"

② سیدنا عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَسَتَرَوْنَ مِنْ بَعْدِي اخْتِلَافًا شَدِيدًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ»[1]

"اور تم میرے بعد سخت اختلاف دیکھو گے، تو میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو اختیار کرنا، اسے ڈاڑھوں سے پکڑ کر رکھنا، (اس پر مضبوطی سے قائم رہنا)۔"

جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اتباع کا لفظ بولا تو اس سے خلافت یعنی سیاسہ شرعیہ (اجتماعی مصالح) پر مبنی اقدامات میں ان کی اتباع مراد ہے، کیونکہ اس باب میں ہی خلفائے راشدین کو باقی صحابہ پر امتیاز حاصل ہے۔ اور جن احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرقہ ناجیہ کے طور پر اپنے اور صحابہ کرام کے منہاج کی بات کی ہے تو اس سے بھی صحابہ کرام کا اسلام پر عمل کرنے کا اجتماعی رویہ مراد ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انفرادی و اجتماعی ہدایات دیا کرتے اور صحابہ اس پر ہر طرح سے عمل پیرا ہوتے۔ تو اس لحاظ سے صحابہ کرام کے معاشرے یعنی خیر القرون کو باقی معاشروں پر فوقیت حاصل ہے کہ ان میں جاری ہونے والے اجتماعی رویے اسلام کی درست ترجمانی کرتے ہیں۔

③ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهِ». وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: مَا نَزَلَ بِالنَّاسِ أَمْرٌ قَطُّ فَقَالُوا فِيهِ وَقَالَ فِيهِ عُمَرُ ـ أَوْ قَالَ ابْنُ الْخَطَّابِ، فِيهِ شَكٌّ خَارِجَةُ ـ إِلَّا نَزَلَ فِيهِ الْقُرْآنُ عَلَى نَحْوِ مَا قَالَ عُمَرُ[2]

"اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان و دل پر حق کو جاری فرما دیا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں: کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس میں لوگوں نے اپنی رائیں پیش کیں ہوں اور عمر بن خطاب نے (راوی خارجہ کو شک ہو گیا ہے) بھی رائے دی ہو۔ مگر قرآن اس واقعہ سے متعلق عمرؓ کی اپنی رائے کے موافق نہ اترا ہو۔"

---

1 سنن ابن ماجه: كِتَابُ السُّنَّةِ (بَابُ اتِّبَاعِ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ)، رقم ۴۲، شیخ البانی، شیخ ارناؤط نے اس حدیث کو صحیح اور شیخ زبیر علی زئی نے حسن قرار دیا ہے۔ امام ترمذی، امام نووی، ابو نعیم، اور قاضی زکریا انصاری (م ۹۲۶ھ) نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

2 جامع الترمذي: أَبْوَابُ الْمَنَاقِبِ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ (بَابٌ فِي مَنَاقِبِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ)، رقم ۳۶۸۲، صحیح

نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کی بنا پر سیدنا عمر بن عبد العزیز نے مال فے کے انہی مصارف کو اختیار کیا جو سیدنا عمر نے اپنے عہد میں طے کردیے تھے، اور مسلمانوں نے بھی اس کو ہی عدل پر مبنی پایا تھا۔ اور وہ یہ تھے کہ مال فے صرف مسلمانوں کو ملے گا، اہل ذمہ کو نہیں، جن کا خمس یا غنیمت میں بھی کوئی حصہ نہیں[1]۔ اسی طرح سیدنا عمر بن عبد العزیز نے شروط عمریہ کے بارے میں بھی وہی موقف اختیار کیا ہے جو سیدنا عمر بن خطاب نے صحابہ کرام کے اجماع سے طے کردیا تھا، تفصیل آگے آرہی ہے۔

شروط عمریہ اور احادیث وآثار

شروطِ عمریہ کی تفصیلات مختلف ذرائع سے ملتی ہیں۔ خیر القرون کی ایک اہم دستاویز ہونے کے ناطے یہ شرائط کتب حدیث میں بھی ہیں، اور کتب تاریخ میں بھی۔ اور اہم فقہی احکام کی حامل ہونے کی بنا پر فقہی کتب میں بھی ان کا تذکرہ ملتا ہے، جیسا کہ اس کی تفصیلات آرہی ہیں۔

شروط عمریہ کتب حدیث میں مختلف اسناد کے ساتھ ملتی ہیں، جن میں بعض مجمل ہیں اور بعض مفصل، بعض کی اسناد میں کوئی علت اور بعض صحیح السند۔ بعض روایات میں شروط عمریہ سیدنا عمر سے ثابت ہوتی ہیں اور بعض میں سیدنا عمر بن عبد العزیز اور دیگر خلفائے اسلام سے۔ ملاحظہ فرمائیں:

① عبد اللہ بن امام احمد بن حنبل (م ۲۹۰ھ) فرماتے ہیں کہ بلادِ شام کے گورنر، صحابی عبد الرحمٰن بن غنم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

كَتَبَ أَهْلُ الْجَزِيرَةِ إِلَى عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ غَنْمٍ إِنَّا حِينَ قدمت بلادنا طلبنا إِلَيْكَ الْأَمَانَ لِأَنْفُسِنَا وَأَهْلِ مِلَّتِنَا، عَلَى أَنَّا شَرَطْنَا لَكَ على أنفسنا (۱) أَنْ لَا نُحْدِثَ فِي مدينتنا كَنِيسَةً ولا فيما حولها ديرًا، ولا قلاية (بناء كالدير)، ولا صومعة راهب، (۲) ولا نجدد ما خرب من كنائسنا، ولا ما كان منها في خطط المسلمين، (۳) وأن لا نمنع كنائسنا من المسلمين أن ينزلوها في الليل والنهار، وأن نوسع أبوابها للمارة وابن السبيل، (٤) ولا نؤوي فيها ولا في منازلنا جاسوسًا، وألا نكتم غشا للمسلمين، (٥) وَأَلَّا نَضْرِبَ نَوَاقِيسَنَا إِلَّا ضَرْبًا خَفِيًّا فِي جَوْفِ كَنَائِسِنَا، وَلَا نُظْهِرَ عَلَيْهَا صَلِيبًا، وَلَا نَرْفَعَ أَصْوَاتَنَا فِي الصَّلَاةِ وَلَا الْقِرَاءَةِ فِي كنائسنا فيما يَحْضُرُهُ الْمُسْلِمُونَ، (٦) وَأَلَّا نُخْرِجَ صَلِيبًا وَلَا كِتَابًا فِي سُوقِ الْمُسْلِمِينَ، وَأَلَّا نُخْرِجَ بَاعُوثًا – قَالَ: وَالْبَاعُوثُ يَجْتَمِعُونَ كَمَا يَخْرُجُ الْمُسْلِمُونَ يَوْمَ الْأَضْحَى وَالْفِطْرِ – وَلَا شَعَانِينَ، (۷)

---

1 سنن أبي داود: كتاب الخراج والإمارة والفيء (باب في تدوين العطاء)، رقم ۲۹۶۱

وَلَا نَرْفَعَ أَصْوَاتَنَا مَعَ مَوْتَانَا، وَلَا نُظْهِرَ النِّيرَانَ مَعَهُمْ فِي أَسْوَاقِ الْمُسْلِمِينَ، وَأَلَّا نُجَاوِرَهُمْ بِالْخَنَازِيرِ وَلَا بَيْعِ الْخُمُورِ، وَلَا نُظْهِرَ شِرْكَنَا، (٨) وَلَا نُرْغِبَ فِي دِينِنَا وَلَا نَدْعُوَ إِلَيْهِ أَحَدًا، (٩) وَلَا نَتَّخِذَ شَيْئًا مِنَ الرَّقِيقِ الَّذِي جَرَتْ عَلَيْهِ سِهَامُ الْمُسْلِمِينَ، (١٠) وَأَلَّا نَمْنَعَ أَحَدًا مِنْ أَقْرِبَائِنَا أَرَادُوا الدُّخُولَ فِي الْإِسْلَامِ، (١١) وَأَنْ نَلْزَمَ زِيَنَا حَيْثُمَا كُنَّا، وَأَلَّا نَتَشَبَّهَ بِالْمُسْلِمِينَ فِي لُبْسِ قَلَنْسُوَةٍ وَلَا عِمَامَةٍ وَلَا نَعْلَيْنِ وَلَا فَرْقِ شَعْرٍ وَلَا فِي مَرَاكِبِهِمْ، وَلَا نَتَكَلَّمَ بِكَلَامِهِمْ وَأَنْ لَا نَتَكَنَّى بِكُنَاهُمْ، (١٢) وَأَنْ نَجُزَّ مَقَادِمَ رُءُوسِنَا، وَلَا نَفْرُقَ نَوَاصِيَنَا، وَنَشُدَّ الزَّنَانِيرَ عَلَى أَوْسَاطِنَا، وَلَا نَنْقُشَ خَوَاتِمَنَا بِالْعَرَبِيَّةِ، وَلَا نَرْكَبَ السُّرُوجَ، وَلَا نَتَّخِذَ شَيْئًا مِنَ السِّلَاحِ وَلَا نَحْمِلَهُ وَلَا نَتَقَلَّدَ السُّيُوفَ، (١٣) وَأَنْ نُوَقِّرَ الْمُسْلِمِينَ فِي مَجَالِسِهِمْ وَنُرْشِدَهُمُ الطَّرِيقَ وَنَقُومَ لَهُمْ عَنِ الْمَجَالِسِ إِنْ أَرَادُوا الْجُلُوسَ، وَلَا نَطَّلِعَ عَلَيْهِمْ فِي مَنَازِلِهِمْ، (١٤) وَلَا نُعَلِّمَ أَوْلَادَنَا الْقُرْآنَ، (١٥) وَلَا يُشَارِكَ أَحَدٌ مِنَّا مُسْلِمًا فِي تِجَارَةٍ إِلَّا أَنْ يَكُونَ إِلَى الْمُسْلِمِ أَمْرُ التِّجَارَةِ، (١٦) وأن نضيف كل مسلم عابر سبيل ثلاثة أيام، ونطعمه من أوسط ما نجد. ضَمِنَّا لَكَ ذَلِكَ عَلَى أَنْفُسِنَا وَذَرَارِيِّنَا وَأَزْوَاجِنَا وَمَسَاكِنِنَا، وَإِنْ نَحْنُ غَيَّرْنَا، أَوْ خَالَفْنَا عَمَّا شَرَطْنَا عَلَى أَنْفُسِنَا، وَقَبِلْنَا الْأَمَانَ عَلَيْهِ فَلَا ذِمَّةَ لَنَا، وَقَدْ حَلَّ لَكَ مِنَّا مَا يَحِلُّ لِأَهْلِ الْمُعَانَدَةِ وَالشِّقَاقِ. فَكَتَبَ بِذَلِكَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ غَنْمٍ إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، فَكَتَبَ إِلَيْهِ عُمَرُ: أَنْ أَمْضِ لَهُمْ مَا سَأَلُوا، وَأَلْحِقْ فِيهِ حَرْفَيْنِ اشْتَرِطْهَا عَلَيْهِمْ مَعَ مَا شَرَطُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ: (١٧) أَنْ لَا يَشْتَرُوا مِنْ سَبَايَانَا شَيْئًا، (١٨) وَمَنْ ضَرَبَ مُسْلِمًا عَمْدًا فَقَدْ خَلَعَ عَهْدَهُ. فأنفذ عبد الرحمن بن غنم ذلك، وأقر من أقام من الروم في مدائن الشام عَلَى هذا الشرط.[1]

"اہل جزیرہ نے عبد الرحمن بن غنم کو لکھا کہ جب آپ ہمارے علاقوں پر فاتح ہو گئے تو ہم اپنے اور اپنے مذہب والوں کے لئے آپ سے ان شرطوں پر امان مانگتے ہیں کہ (۱) ہم اپنے پر لازم کرتے ہیں کہ ہم اپنے شہروں اور ان کے گرد و نواح میں کوئی نیا گرجا، بلند گرجا، راہب کا معبد خانہ[2] نہیں بنائیں

---

[1] أبوبكر الخلال البغدادي (٣١١ هـ)، أحكام أهل الملل والردة من الجامع لمسائل أحمد بن حنبل: حاشيه ص ١١ رقم ١٠٠٠، ١/ ٣٦٠، طبع أوّل، دار الكتب العلمية، ١٩٩٤م وزوائد مسند احمد بن حنبل (لم أجده)

[2] عیسائیوں کے ہاں معابد کی کئی ایک قسمیں ہیں، بعض انفرادی اور بعض اجتماعی عبادت کے لئے اور بعض بلند، بعض عام گھروں جیسے۔ اور ان خصوصیات کے لحاظ سے ان کے نام مختلف ہیں۔ صومعہ صرف معبد کو کہا جاتا ہے، کنیسہ، دیر اور قلایہ عیسائی گرجاؤں کے مختلف نام ہیں۔ جن میں قلایہ کی بجائے قلایہ یعنی ی کی بجائے ب کا لفظ بھی بولا گیا ہے۔ اور بیع کا لفظ یہودی اور عیسائی معابد، دونوں کے لئے عام ہے۔ ان معابد کی مزید تفصیل نواب صدیق حسن خاں کی زبانی آیت ذمہ (التوبہ:۲۹) کی تشریح میں دیکھی جا سکتی ہے۔

گے اور (۲) اپنے خراب شدہ کنیساؤں کی تجدید نہیں کریں گے، نہ ہی ان کنیساؤں کی جو مسلمانوں کے علاقوں میں ہیں۔ (۳) اور اپنے کنیساؤں میں مسلمانوں کو رات یا دن کے کسی حصے میں قیام سے نہیں روکیں گے۔ اور راہ گزروں، اور مسافروں کے لئے ان کے دروازے کشادہ کریں گے۔ (۴) اور ان کنیساؤں یا اپنے گھروں میں کسی جاسوس کو ٹھکانہ نہیں دیں گے۔ مسلمانوں سے دھوکہ کرتے ہوئے کسی کو نہیں چھپائیں گے۔ (۵) اور یہ کہ ہم اپنے ناقوس اس سے زیادہ بلند نہ کریں گے کہ ان کی آواز کنیسہ کے اندر ہی سنائی دے۔ اور ہم صلیب کو نمایاں نہیں کریں گے۔ اور اپنی نماز یا انجیل پڑھتے ہوئے ہماری آوازیں مسلمانوں تک نہیں پہنچیں گی۔ (۶) اور ہم صلیب یا کوئی جتھہ مسلمانوں کے بازار میں نہیں نکالیں گے۔ اور باعوث بھی نہیں نکالیں گے، باعوث عیسائیوں کے ایسے اجتماع کو کہتے ہیں جیسا کہ مسلمان عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو کھلے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ شعانین (باعوث سے ملتا جلتا تہوار) نہیں نکالیں گے۔ (۷) اور اپنے مردوں کے ساتھ مسلمانوں کے بازار میں آوازیں اور آگ کو بلند نہیں کریں گے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ خنزیروں کو نہیں رکھیں گے اور نہ شراب فروخت کریں گے۔ اور نہ اپنے شرک کو نمایاں کریں گے۔ (۸) اپنے دین کی ترغیب اور دوسروں کو اس کی دعوت نہیں دیں گے۔ (۹) اس غلام کے حصے سے دستبردار ہو جائیں گے جس میں مسلمانوں کا بھی حصہ ہو۔ (۱۰) اپنے اقربا کو اسلام قبول کرنے سے نہیں روکیں گے، اگر وہ اسلام لانا چاہیں۔ (۱۱) اور جہاں بھی ہوں، اپنے اطوار وعادات پر کاربند رہیں گے۔ اور ہم مسلمانوں کے لباس، ٹوپی، عمامہ، جوتے، بال سنوارنے میں ان کی مشابہت نہیں کریں گے۔ ان کے طرز تکلم کو اختیار نہ کریں گے، ان جیسی کنیتیں نہ رکھیں گے۔ (۱۲) اپنی پیشانی کے بال کٹوائیں گے، اور (مسلمانوں کی طرح) مانگ نہ نکالیں گے اور اپنی کمر میں پٹی باندھیں گے۔ اپنی انگوٹھیوں پر عربی نقش نہیں بنوائیں گے، اور گھوڑے پر (مسلمانوں جیسی) زین نہ رکھیں گے۔ کوئی اسلحہ نہ رکھیں گے، نہ لے کر چلیں گے اور نہ ہی تلوار لٹکائیں گے۔ (۱۳) نشستوں میں مسلمانوں کی عزت افزائی کریں گے اور ان کو راستہ بتائیں گے۔ اگر وہ بیٹھنا چاہیں تو اپنی نشستوں سے اٹھ جائیں گے۔ ان کے گھروں میں نہیں جھانکیں گے۔ (۱۴) اپنی اولاد کو قرآن نہیں پڑھائیں گے۔ (۱۵) اور ہم میں کوئی مسلمان سے شراکتی کاروبار کرے تو اس میں مسلمان فیصلہ کن رہا بالاتر ہوگا۔ (۱۶) اور ہر مسلمان مسافر کی تین روز تک مہمان نوازی کریں گے، اور بقدر طاقت اوسط درجے کا کھانا اسے کھلائیں گے۔ ہم مسلمانوں کے ساتھ ان شرائط میں اپنے آپ، اپنی اولاد، اپنی بیویوں اور اپنے گھروں کو ضامن بناتے ہیں۔ اگر ہم نے ان میں کوئی تبدیلی کی یا طے شدہ شرطوں اور جن پر ہم نے امان لی ہے، ان کی مخالفت کی تو ہمارا مسلمانوں پر

کوئی ذمہ نہیں۔ اور آپ کے لئے ہمارے ساتھ وہ سلوک جائز ہے جو لڑائی اور اختلاف والوں سے جائز ہوتا ہے۔ یہ شرطیں عبدالرحمٰن بن غنم نے سیدنا عمر کو لکھ بھیجیں تو سیدنا عمر بن خطاب نے جواب دیا کہ جو وہ مانگ رہے ہیں، وہ انہیں دے دو اور ان کی اپنے اوپر قائم کردہ شرائط پر دو شرطوں کا اضافہ کردو کہ (۱۷) ہمارے قیدیوں سے کچھ نہیں خریدیں گے، اور (۱۸) جس نے کسی مسلمان کو عمداً مارا پیٹا تو اس کا عہد ختم۔ سو عبدالرحمٰن بن غنم نے (۱۶ھ میں) ان شرطوں کو شامی شہروں میں بسنے والے رومی عیسائیوں پر نافذ کر دیا۔"

اس متن کو نامور محدث وفقیہ امام ابو بکر خلال (۳۱۱ھ) نے اپنی کتاب أحكام أهل الملل (جو بیس جلدوں پر محیط الجامع لمسائل الامام احمد بن حنبل کا حصہ ہے) میں عبداللہ بن احمد بن حنبل کے طریق سے بیان کیا ہے جس کی سند یوں ہے:

فقد روى ابنه عبد الله في زوائده على المسند، فقال: حدثني أبو شرحبيل الحمصي حدثني (عمي) أبو اليمان وأبو المغيرة قالا: أخبرنا إسماعيل بن عياش قال: حدثنا غير واحدٍ من أهل العلم قالوا:...

"عبداللہ بن احمد بن حنبل نے مسند احمد کے زوائد میں روایت کیا ہے، کہتے ہیں کہ مجھے ابو شرحبیل حمصی نے بتایا کہ مجھے میرے چچا ابو یمان اور ابو مغیرہ نے بتایا، ان دونوں کو اسماعیل بن عیاش نے کہا کہ مجھے ایک سے زیادہ اہل علم نے روایت کرتے ہوئے کہا:...

② یہی روایت سنن کبریٰ از امام بیہقی (م۴۵۸ھ) میں بعض الفاظ کے معمولی فرق سے یوں ہے:

كَتَبْتُ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ حِينَ صَالَحَ أَهْلَ الشَّامِ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ هَذَا كِتَابٌ لِعَبْدِ اللهِ عُمَرَ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ مِنْ نَصَارَى مَدِينَةِ كَذَا وَكَذَا إِنَّكُمْ لَمَّا قَدِمْتُمْ عَلَيْنَا سَأَلْنَاكُمُ الْأَمَانَ لِأَنْفُسِنَا وَذَرَارِيِّنَا وَأَمْوَالِنَا وَأَهْلِ مِلَّتِنَا وَشَرَطْنَا لَكُمْ عَلَى أَنْفُسِنَا أَنْ لَا نُحْدِثَ فِي مَدِينَتِنَا وَلَا فِيمَا حَوْلَهَا دَيْرًا وَلَا كَنِيسَةً وَلَا قَلَّايَةً وَلَا صَوْمَعَةَ رَاهِبٍ وَلَا نُجَدِّدَ مَا خَرِبَ مِنْهَا وَلَا نُحْيِيَ مَا كَانَ مِنْهَا فِي خُطَطِ الْمُسْلِمِينَ وَأَنْ لَا نَمْنَعَ كَنَائِسَنَا أَنْ يَنْزِلَهَا أَحَدٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فِي لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ وَأَنْ نُوَسِّعَ أَبْوَابَهَا لِلْمَارَّةِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَأَنْ نُنْزِلَ مَنْ مَرَّ بِنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَنُطْعِمَهُمْ وَأَنْ لَا نُؤْمِنَّ فِي كَنَائِسِنَا وَلَا مَنَازِلِنَا جَاسُوسًا وَلَا نَكْتُمَ غِشًّا لِلْمُسْلِمِينَ وَلَا نُعَلِّمَ أَوْلَادَنَا الْقُرْآنَ وَلَا نُظْهِرَ شِرْكًا وَلَا نَدْعُوَ إِلَيْهِ أَحَدًا وَلَا نَمْنَعَ أَحَدًا مِنْ قَرَابَتِنَا الدُّخُولَ فِي الْإِسْلَامِ إِنْ أَرَادَهُ وَأَنْ نُوَقِّرَ الْمُسْلِمِينَ وَأَنْ نَقُومَ لَهُمْ مِنْ مَجَالِسِنَا إِنْ أَرَادُوا جُلُوسًا وَلَا نَتَشَبَّهَ بِهِمْ فِي شَيْءٍ مِنْ لِبَاسِهِمْ مِنْ قَلَنْسُوَةٍ وَلَا عِمَامَةٍ وَلَا نَعْلَيْنِ وَلَا فَرْقِ شَعَرٍ

وَلَا نَتَكَلَّمَ بِكَلَامِهِمْ وَلَا نَتَكَنَّى بِكُنَاهُمْ وَلَا نَرْكَبَ السُّرُوجَ وَلَا نَتَقَلَّدَ السُّيُوفَ وَلَا نَتَّخِذَ شَيْئًا مِنَ السِّلَاحِ وَلَا نَحْمِلَهُ مَعَنَا وَلَا نَنْقُشَ خَوَاتِيمَنَا بِالْعَرَبِيَّةِ وَلَا نَبِيعَ الْخُمُورَ وَأَنْ نَجُزَّ مَقَادِيمَ رُءُوسِنَا وَأَنْ نَلْزَمَ زِيَّنَا حَيْثُ مَا كُنَّا وَأَنْ نَشُدَّ الزَّنَانِيرَ عَلَى أَوْسَاطِنَا وَأَنْ لَا نُظْهِرَ صُلُبَنَا وَكُتُبَنَا فِي شَيْءٍ مِنْ طَرِيقِ الْمُسْلِمِينَ وَلَا أَسْوَاقِهِمْ وَأَنْ لَا نُظْهِرَ الصَّلِيبَ عَلَى كَنَائِسِنَا وَأَنْ لَا نَضْرِبَ بِنَاقُوسٍ فِي كَنَائِسِنَا بَيْنَ حَضْرَةِ الْمُسْلِمِينَ وَأَنْ لَا نُخْرِجَ سَعَانِينَا وَلَا بَاعُوثَنَا وَلَا نَرْفَعَ أَصْوَاتَنَا مَعَ أَمْوَاتِنَا وَلَا نُظْهِرَ النِّيرَانَ مَعَهُمْ فِي شَيْءٍ مِنْ طَرِيقِ الْمُسْلِمِينَ وَلَا نُجَاوِرَهُمْ مَوْتَانَا ... فَلَمَّا أَتَيْتُ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ بِالْكِتَابِ زَادَ فِيهِ: وَأَنْ لَا نَضْرِبَ أَحَدًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ شَرَطْنَا لَهُمْ ذَلِكَ عَلَى أَنْفُسِنَا وَأَهْلِ مِلَّتِنَا وَقَبِلْنَا مِنْهُمُ الْأَمَانَ فَإِنْ نَحْنُ خَالَفْنَا شَيْئًا مِمَّا شَرَطْنَاهُ لَكُمْ فَضَمِنَّاهُ عَلَى أَنْفُسِنَا فَلَا ذِمَّةَ لَنَا وَقَدْ حَلَّ لَكُمْ مَا يَحِلُّ لَكُمْ مِنْ أَهْلِ الْمُعَانَدَةِ وَالشِّقَاوَةِ.[1]

”میں نے سیدنا عمر کو یہ معاہدہ لکھ بھیجا، جب انہوں نے اہل شام سے صلح کی... بسم اللہ الرحمن الرحیم، یہ اللہ کے بندے عمر بن خطاب کا فلاں فلاں شہروں کے عیسائیوں سے معاہدہ ہے۔ اور یہ کہ اپنے کنیساؤں اور گھروں میں کسی جاسوس کو پناہ نہیں دیں گے۔ اور مسلمانوں کے لئے دل میں بغض وکینہ نہیں رکھیں گے۔ (۱) اور اپنی اولاد کو قرآن کریم نہیں سکھائیں گے۔ (۲) شرک کو نمایاں کریں گے نہ اس کی دعوت دیں گے۔ اپنے اقربا کو ان کی کھلی مرضی سے اسلام قبول کرنے سے نہیں روکیں گے۔ مسلمانوں کی عزت افزائی کریں گے، اگر بیٹھنا چاہیں تو اپنی نشست چھوڑ دیں گے۔ (۳) اور ہم مسلمانوں کے لباس، ٹوپی، عمامہ، جوتے، بال سنوارنے میں ان کی مشابہت نہیں کریں گے۔ (۴) ان کے طرز تکلم کو اختیار نہ کریں گے، ان جیسی کنیتیں نہ رکھیں گے۔ (۵) گھوڑے پر زین نہ رکھیں گے۔ (۶) تلوار کو گلے میں نہ لٹکائیں گے، نہ اسلحہ رکھیں گے، نہ ساتھ لے کر چلیں گے۔ (۷) اپنی انگوٹھیوں پر عربی نقوش نہ بنوائیں گے۔ اور شراب کی خرید وفروخت نہ کریں گے۔ (۸) پیشانی سے اوپر بالوں کو منڈائیں گے۔ (۹) اپنے اطوار اور فیشن ہی اختیار کریں گے۔ اور زنار (حزام رپٹکا) کو درمیان میں باندھیں گے۔ (۱۰) اپنی صلیبیں اور کتابیں مسلمانوں کے راستوں اور بازاروں میں نہیں

1 أحمد بن حسين، أبوبكر بيهقي (م٤٥٨ هـ) السنن الكبرى: ١٨٧١٧، ج ٩/ص٣٣٩، باب الإمام يكتب كتاب الصلح على الجزية، دار الكتب العلمية، بيروت ٢٠٠٣م

رکھیں گے۔(۱۱) سعانین اور باعون[1] (عیسائی عیدیں) نہ نکالیں گے۔(۱۲) اپنے مردوں پر آوازیں بلند نہ کریں گے۔ مسلمانوں کے راستے میں اپنے مردوں کے ساتھ آگ لے کر نہ چلیں گے۔(۱۳) اور اپنے مردے ان کے ساتھ دفن نہ کریں گے۔"

جب یہ معاہدہ سیدنا عمر کے پاس پہنچا تو آپ نے اس میں ان باتوں کا مزید اضافہ فرمایا: (۱۴) کسی مسلمان کو ماریں گے نہیں۔(۱۵) ہم نے ان سے امان لی ہے، تو خود ان شرطوں کو اپنے اوپر اور اپنے دین والوں قائم کیا ہے۔(۱۶) اگر ان شرطوں میں کسی کی ہم مخالفت کریں تو اس پر اپنے آپ کو ہی ضامن بناتے ہیں، تب ہمارا کوئی ذمہ نہ ہو گا۔ اور ہماری وہی سزا جو دشمنوں اور بدبختوں کا مقدر ہے۔"

③ امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبد اللہ روایت کرتے ہیں کہ سیدنا عمر بن عبد العزیز نے یہ حکم نامہ جاری کیا:

كَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى أَنْ يَنْهَوُا النَّصَارَى أَنْ يَفْرِقُوا رُءُوسَهُمْ، وَتُجَزَّ نَوَاصِيهِمْ، وَأَنْ تُشَدَّ مَنَاطِقُهُمْ، وَلَا يَرْكَبُوا عَلَى سَرْجٍ، وَلَا يَلْبَسُوا عَصَبًا وَلَا خَزًّا، وَأَنْ يُمْنَعَ نِسَاؤُهُمْ أَنْ يَرْكَبْنَ الرَّحَائِلَ، فَإِنْ قُدِرَ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ فَعَلَ ذَلِكَ بَعْدَ التَّقَدُّمِ إِلَيْهِ فَإِنَّ سَكَنَهُ لِمَنْ وَجَدَهُ.[2]

"عیسائیوں کو روکیں کہ وہ بالوں کی مانگ نکالیں، اور وہ پیشانی کے بال کاٹیں۔ اور یہ کہ وہ کمر پر پٹی باندھیں، اور زین پر سواری مت کریں۔ پگڑی اور ریشم مت پہنیں۔ ان کی عورتیں چمڑے کی زین میں سوار نہ ہوں۔ اگر حکم پہنچنے کے باوجود کوئی شخص پکڑا گیا تو پکڑنے والا اسکی رہائش کا مالک ہو گا۔"

احکام اہل الذمہ کے محقق یوسف بن احمد بکری تلمیذ شیخ محمد ناصر الدین البانی لکھتے ہیں کہ

"وهذا إسناد صحيح رجاله ثقات رجال الشيخين، سوى عبد الله بن الإمام أحمد بن حنبل وهو ثقة كما في التقريب"[3]

"اس اثر کی سند بالکل صحیح ہے، اس کے راوی ثقہ ر معتمد اور صحیحین کے راوی ہیں۔ سوائے عبد اللہ بن امام احمد بن حنبل کے اور وہ بھی ثقہ ہیں جیسا کہ تقریب میں صراحت ہے۔"

---

1 سعانین کو گذشتہ حدیث میں ش کے ساتھ شعانین بھی لکھا گیا ہے، جبکہ پچھلی روایت میں ان باعون کو باعوث یعنی ن کی بجائے ث کے ساتھ بھی لکھا گیا ہے۔ چونکہ یہ اسم الصوت ہیں، اس لئے ان کے ضبط میں لکھنے والوں کے مابین اختلاف رہا ہے۔ بہر حال ان سے مراد عیسائیوں کے مسلمانوں کی عید الفطر اور عید الاضحیٰ سے ملتے جلتے تہوار ہیں۔

2 أحكام اهل الملل والردة من الجامع لمسائل أحمد بن حنبل: رقم ٩٩٣، ٣٥٤/١، دار الكتب العلمية، بيروت ١٩٩٤م؛ أحكام أهل الذمة: ١٢٧٨/٣

3 ابو عبد الله محمد بن أبوبكر ابن قيم الجوزية، أحكام أهل الذمة: ١٢٧٨/٣، محقق: يوسف بن أحمد البكري، الرمادي للنشر، الدمام، 1997م

④ ابو شیخ اصبہانی نے معمر بن راشد سے روایت کیا کہ سیدنا عمر بن عبد العزیز نے یہ حکم نامہ جاری کیا:

أَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ كَتَبَ "أَنِ امْنَعْ مَنْ قِبَلَكَ فَلَا يَلْبَسُ نَصْرَانِيٌّ قَبَاءً وَلَا ثَوْبَ خَزٍّ وَلَا عَصَبٍ، وَتَقَدَّمْ فِي ذَلِكَ أَشَدَّ التَّقَدُّمِ حَتَّى لَا يَخْفَى عَلَى أَحَدٍ نَهْيٌ عَنْهُ، وَقَدْ ذُكِرَ لِي أَنَّ كَثِيرًا مِمَّنْ قِبَلَكَ مِنَ النَّصَارَى قَدْ رَاجَعُوا لُبْسَ الْعَمَائِمِ وَتَرَكُوا الْمَنَاطِقَ عَلَى أَوْسَاطِهِمْ وَاتَّخَذُوا الْوَفْرَ وَالْجُمَمَ، وَلَعَمْرِي إِنْ كَانَ يُصْنَعُ ذَلِكَ فِيمَا قِبَلَكَ إِنَّ ذَلِكَ بِكَ ضَعْفٌ وَعَجْزٌ، فَانْظُرْ كُلَّ شَيْءٍ نُهِيَتَ عَنْهُ وَتَقَدَّمْتَ فِيهِ فَلَا تُرَخِّصْ فِيهِ وَلَا تُغَيِّرْ مِنْهُ شَيْئًا "[1]

"آپ کی طرف رہنے والے لوگوں کو روکو کہ نصرانی قبا، اور ریشمی کپڑا اور پگڑی نہ پہنیں۔ اور اس میں پوری سختی کرو، تاکہ کسی سے یہ آرڈر مخفی نہ رہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کی طرف رہنے والے بہت سے عیسائیوں نے عمامے پہننے شروع کر دیے ہیں، اور اپنے کمر بند چھوڑ دیے اور بال چھوٹے رکھنے کی بجائے کان کی لو تک بال اور لمبے پٹے (زلفیں) رکھنا شروع کر دیے ہیں۔ میری عمر کی قسم! اگر یہ سب کچھ تمہارے پاس ہوتا رہا تو یہ سراسر تمہاری کمزوری اور حکم کی تعمیل سے روگردانی ہے۔ جس جس چیز سے تمہیں روکا گیا اور تم نے تجاوز کیا، تو اسی میں سستی مت کرو اور کچھ بھی تبدیلی نہ کرو۔"

⑤ ابو شیخ اصبہانی نے اپنی سند سے عبد الرحمٰن بن حبان سے روایت کیا ہے کہ

دَخَلَ نَاسٌ مِنْ بَنِي تَغْلِبَ عَلَى عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ عَلَيْهِمُ الْعَمَائِمُ كَهَيْئَةِ الْعَرَبِ، قَالُوا: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ، أَلْحِقْنَا بِالْعَرَبِ. قَالَ: فَمَنْ أَنْتُمْ؟ قَالُوا: نَحْنُ بَنُو تَغْلِبَ. قَالَ: أَوَلَسْتُمْ مِنْ أَوْسَطِ الْعَرَبِ؟ قَالُوا: نَحْنُ نَصَارَى. قَالَ: عَلَيَّ بِجَلَمٍ، فَأَخَذَ مِنْ نَوَاصِيهِمْ وَأَلْقَى الْعَمَائِمَ وَشَقَّ مِنْ رِدَاءِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ شِبْرًا يَحْتَزِمُ بِهِ وَقَالَ: لَا تَرْكَبُوا السُّرُوجَ، وَارْكَبُوا الْأُكُفَ وَدَلُّوا أَرْجُلَكُمْ مِنْ شَقٍّ وَاحِدٍ.[2]

"بنو تغلب کے چند لوگ سیدنا عمر بن عبد العزیز کے پاس آئے اور انہوں نے عربوں جیسے عمامے پہن رکھے تھے۔ تو کہنے لگے: یا امیر المؤمنین! ہم عرب میں ملے ہوئے ہیں۔ آپ نے پوچھا: تم کون ہو؟ بولے: ہم بنو تغلب ہیں۔ پوچھا: کیا عرب قبائل سے نہیں؟ تو بولے: ہم عیسائی ہیں۔ تو سیدنا عمر بن عبد العزیز نے قینچی منگائی اور ان کی پیشانی کے بال کاٹ دیے۔ اور ان کے عمامے اُتروا دیے۔ اور ہر ایک

---

1 أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية، إقتضاء الصراط المستقيم: ص ٣٦٨، دار عالم الكتب، بيروت 1419 هـ؛ أحكام أهل الذمة: ٣/١٢٧٣

2 أحكام أهل الذمة: ٣/ ١٢٧٤؛ اقتضاء الصراط المستقيم: ص ٣٦٨

کی چادر کو بقدر بالشت کاٹ دیا، جس سے وہ کمر باندھتے تھے۔ پھر انہیں حکم دیا کہ زینوں پر سوار نہ ہوں، اور پالانوں پر سوار ہوں اور ایک طرف پاؤں لٹکائیں۔"

سیدنا عمر بن عبد العزیز کے آخری روایت میں مذکورہ اقدام اُصولی نہیں بلکہ ان میں تنبیہ وسزا کا پہلو بھی موجود ہے کیونکہ اُنہوں نے عہد شکنی اور مغالطہ دہی کی کوشش کی تھی۔

اس حدیث (موقوف) کی تخریج وتحقیق

یہ روایت درجنوں اسانید کے ساتھ مروی ہے، اور صحیح السند کے ساتھ مقبول ہے، جیسا کہ

① مسند احمد کے زوائد میں، عبد اللہ بن احمد بن حنبل (م ۲۹۰ھ) نے اس کے متن کو سب سے پہلے عبد الرحمن بن غنم کے حوالے سے بیان کیا ہے۔[1] جس کو امام ابو بکر خلال بغدادی (م ۳۱۱ھ) نے اپنی کتاب أحكام أهل الملل (جو الجامع لمسائل احمد بن حنبل کا حصہ ہے) میں ذکر کیا ہے۔ پھر متداول کتب حدیث میں امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) نے السنن الکبری میں ذکر کیا ہے۔ انہی سالوں میں حافظ ابن حزم (م ۴۵۲ھ) نے المحلی میں بھی اس کو ذکر[2] کیا ہے۔

② شروطِ عمریہ کی متعدد روایات کو قاضی ابو محمد حافظ ابن زبر ربعی (م ۳۲۹ھ) نے جزء فيه شروط النصارٰى کے نام سے مستقل رسالہ میں جمع کیا ہے (جو راقم کے پاس موجود ہے۔) اور یہ شروطِ عمریہ کی دوسری پرانی اور بنیادی دستاویز ہے۔ Prinston University کے امریکی یہودی مستشرق مارک کوہن Mark Cohen نے تحقیق کے بعد اس کو شائع کیا ہے اور دار الکتب المصریہ کے مخطوطہ[3] کو بنیاد بنایا ہے۔[4]

③ شروطِ عمریہ کی مزید اسانید کو ابو عمرو عثمان ابن السماک (م ۳۴۴ھ) نے ایک مستقل رسالہ جزء فيه

---

١ ابو بکر خلال بغدادی نے اپنی کتاب أحكام أهل الملل میں عبد اللہ بن احمد بن حنبل کے طریق سے نمبر ۱۰۰۰ کے تحت اس کو روایت کیا ہے۔

٢ حافظ علی بن أحمد ابن حزم اندلسي، المحلی بالآثار: ٧/٣٤٦، (٤١٤، ٤١٥)، رقم ٩٥٩ دار الفکر، بیروت، س ن .. المحلی کے مقدمہ میں آپ لکھتے ہیں: لم نحتج إلا بخبر صحيح من رواية الثقات مسند.

٣ حدیث اور تاریخ کے دو علوم سے متعلق ہونے کی بنا پر دو جگہ پر اس کا ریکارڈ ہے: تاریخ تیمور نمبر ۲۲۵۲ اور حدیث ۲۲۱۸، مائیکرو فلم نمبر ۴۸۶۰۸

٤ دیکھیے: نظام محمد صالح يعقوبي، جزء فيه شروط أمير المؤمنين عمر بن الخطاب: ص ١٢، دار البشائر الإسلامية، بيروت ٢٠٠١ء

شروط أمیر المؤمنین عمر بن الخطاب علی النصاری کے نام سے جمع کیا ہے، اور یہ رسالہ ہالینڈ کے لائیڈن یونیورسٹی کے سیکشن 'Oriental Mauniscripsts' میں نمبر OR. ۹۵۱ کے تحت محفوظ ہے۔ وورہوف Voorhoeve نے Handlist of Arabic Manuscripts. (1980) کے صفحہ ۱۰۴ پر اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ رسالہ بھی راقم کے پاس موجود ہے۔[1]

④ حافظ ابن الزبر، ابو عمرو ابن السماک اور حافظ ابن کثیر رحمہم اللہ نے تین مستقل رسالے اس کی روایات واسناد پر لکھے ہیں۔ اور اس کی بہت سی اسناد تاریخ دمشق (ناشر: دار احیاء التراث العربی) کے جلد دوم، ص ۱۱۹ تا ۱۲۷ پر بھی جمع کر دی گئی ہیں۔

⑤ اس روایت کی ایک سند صحابی خالد بن عرفطہ سے بھی مروی ہے، جسے ابو شیخ اصبہانی نے شروط اہل الذمہ میں اپنی سند سے روایت کیا ہے۔ اور ابو شیخ نے عیسائی عورتوں کے لباس میں مشابہت کرنے پر بھی سیدنا عمر کا قول اپنی سند سے روایت کیا ہے۔[2]

⑥ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ابو بکر خلال کی روایت سے 'شروط عمریہ' کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

روى حرب بإسناد صحيح عن عبد الرحمن بن غنم قال: كتب لعمر بن الخطاب حين صالح نصارى أهل الشام: "هذا كتاب لعبد الله أمير المؤمنين من مدينة كذا وكذا إنكم لما قدمتم علينا سألناكم الأمان لأنفسنا وذرارينا وأموالنا على أن لا نحدث وذكر الشروط إلى أن قال: ولا نظهر شركا ولا ندعوا إليه أحدا..."[3]

"حرب کرمانی نے صحیح سند کے ساتھ اس کو عبد الرحمن بن غنم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے شام کے نصاری سے معاہدہ صلح کے وقت یہ معاہدہ سیدنا عمر کو بھیجا، جس کا متن یوں ہے:....."

⑦ امام ابن تیمیہ کے ہم عصر شیخ الاسلام، قاضی القضاۃ تقی الدین سبکی شافعی اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں:

ورواها جماعة بأسانيد ليس فيها يحيي بن عقبة، لكنها أو أكثرها ضعيفة وبانضمام بعضها إلي بعض تقوي.[4]

---

۱ یہ دونوں قیمتی رسالے دار البشائر الاسلامیہ، بیروت نے ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۶ء میں پوری تحقیق کے ساتھ شائع کر دیے ہیں۔

۲ أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية، اقتضاء الصراط المستقيم: ص ٣٦٦، دار عالم الكتب، بيروت ١٤١٩ هـ

۳ أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية، الصارم المسلول: ص ٢٠٨، الحرس الوطني السعودي، الرياض س ن؛ إقتضاء الصراط المستقيم: ص ٣٦٤، رواه حرب بإسناد جيد... امام ابو بکر خلال کی تصنیف 'أحكام الملل' میں اس سلسلے کی بہت سی روایات ہیں۔

۴ تقي الدين علي الكافي ال

"شروط عمریہ کو ایک جماعت نے متعدد اسانید کے ساتھ روایت کیا ہے، جن میں ضعیف راوی یحییٰ بن عقبہ نہیں ہے۔ لیکن وہ روایات یا اکثر روایات ضعیف ہیں۔ تاہم یہ متعدد روایات ایک دوسرے سے مل کر درجہ قبولیت کو پہنچ جاتی ہیں۔"

⑧ یہی بات مفسر و مؤرخ حافظ ابن کثیر نے مسند الفاروق میں اس روایت کے متعدد اسانید بیان کرنے کے بعد کہی: فهذه طُرق يشدّ بعضها بعضًا.[1]

"اس کی متعدد اسانید ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں۔"

ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ

"عبد الرحمن بن غنم تک اس کی معتبر اسناد پہنچتی ہیں، اور میں نے ایک مستقل تصنیف میں ان کو یکجا کر دیا ہے۔"[2]

آپ نے اپنی 'مسند الفاروق' میں شروطِ عمریہ کے نام سے باقاعدہ عنوان قائم کرکے بھی اس کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

تفسیر ابن کثیر میں سورۃ التوبۃ کی آیت جزیہ:۲۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وذلك مما رواه الأئمة الحفاظ من رواية عبد الرحمن بن غنم[3]

⑨ شیخ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح میں اس کی معنوی بنیاد کے طور پر سنن ابو داود کا بھی تذکرہ کیا ہے۔[4]

⑩ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنی چار کتب: الصارم المسلول[5]، إقتضاء الصراط المستقيم، الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح[6] اور مجموع فتاوی ابن تیمیة میں شروطِ عمریہ کی روایات اور تفصیلات پیش کی ہیں، اور ان سے متعدد فقہی استدلال کئے ہیں۔ ایسے ہی ان کے شاگردِ رشید حافظ ابن قیم نے اپنی مایہ ناز کتاب أحكام اهل الذمة کی چھ فصلوں میں، ۱۱۵۹ تا ۱۳۵۲ یعنی دو صد صفحات اور إعلام الموقعين میں اس پر تفصیلاً گفتگو کی ہے اور ان کی بسیط شرح پیش کرتے ہوئے، ان شرائط کے قرآن

---

۱ حافظ إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقي، مسند الفاروق: ۳۹۹/۲، دار الفلاح مصر ۲۰۰۹م

۲ حافظ إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقي، إرشاد الفقيه: ۳٤۱/۲، مؤسسة الرسالة، بيروت

۳ تفسير ابن كثير: ۱۳۳/٤

۴ أخرجه أبو داود في سننه. (الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح از احمد بن عبد الحليم ابن تيميه): ص ۳۰۸

۵ أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية، الصارم المسلول: ص ۲۰۸، ۲۰۹، الحرس الوطني السعودي، الرياض

۶ أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية، الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح: ص ۳۰٤ تا ۳۱٤، تحقيق وتعليق: د/علي بن حسن بن ناصر، دار العاصمة، سعودي عرب ۱۹۹۹م

وسنت میں شرعی دلائل کو بیان کیا ہے۔

اسناد پر مزید تحقیق میں ضرورت اس امر کی ہے کہ 'زوائد مسند امام احمد بن حنبل' نامی کتاب میں، شروطِ عمریہ کی اوّلین روایت کی سند کو تلاش کیا جائے، جبکہ زوائد کے ڈاکٹر عامر حسن صبری کے تحقیق شدہ ایک مجموعے، طبع دار البشائر الاسلامیہ میں یہ روایت راقم کو نہیں مل سکی۔

شروطِ عمریہ کی بعض اسانید ضعیف بھی ہیں جبکہ شیخ ابن تیمیہ نے جس حرب کرمانی کی روایت کو کبھی صحیح اور کبھی جید قرار دیا ہے، اس کی مکمل سند بھی بسیار کوشش کے باوجود نہیں مل سکی۔ جب تک اس کی سند دریافت نہ ہو جائے، اس وقت تک شیخ ابن تیمیہ کے حکم صحت پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔

حافظ ابن کثیر اور امام سبکی شافعی کا موقف ہے کہ شروطِ عمریہ کی متعدد اسانید مل کر قوی ہو جاتی ہیں۔

جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے تو شروطِ عمریہ کی فقہی اور شرعی حیثیت سیدنا عمر بن عبد العزیز کے اجرا سے بھی متعین ہو جاتی ہے جس کی سند أحكام أهل الملل کے حوالے سے بلاشبہ صحیح و معتمد ہے اور خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے اس کو تابعین عظام سے لینے کا دعویٰ کیا ہے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

'شروطِ عمریہ' تاریخ اسلام کے ہر دور میں

① شیخ الاسلام ابو العباس احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) لکھتے ہیں:

وَكَمَا كَتَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَلَى أَهْلِ الذِّمَّةِ هَذِهِ الشُّرُوطَ وَالْتَزَمُوهَا، أَوْصَى بِهِمْ نُوَّابَهُ وَمَنْ يَأْتِي بَعْدَهُ مِنَ الْخُلَفَاءِ وَغَيْرِهِمْ، وَهَذَا هُوَ الْعَدْلُ الَّذِي أَمَرَ اللهُ بِهِ وَرَسُولُهُ.[1]

"جیسا کہ سیدنا عمر بن خطاب نے غیر مسلموں پر ان شرطوں کو لاگو کیا، انہوں نے ان کی پابندی کی۔ تو آپ نے اپنے ماتحت حکام اور بعد میں آنے والے خلفاء وغیرہ کو بھی اس کی نصیحت کی۔ اور یہی وہ عدل ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حاکم کو حکم دیا ہے۔"

② حافظ ابن تیمیہ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

وكذلك فعل جعفر بن محمد بن هارون المتوكل بأهل الذمة في خلافته، واستشار في ذلك الإمام أحمد بن حنبل، وغيره، وعهوده في ذلك، وجوابات أحمد بن حنبل له معروفة.[2]

---

۱ الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح: ۱/ ۳۱۲، دار العاصمة، سعودی عرب ۱۹۹۹ء

۲ اقتضاء الصراط المستقیم: ص ۳۶۸، دار عالم الکتب، بیروت ۱۴۱۹ھ

"عباسی خلیفہ جعفر بن محمد بن ہارون المتوکل باللہ (م ۲۴۷ھ) نے اپنے (۱۴ سالہ) دور خلافت میں غیر مسلموں سے یہی رویہ رکھا۔ اور اس سلسلے میں امام احمد سے مشورہ/رہنمائی بھی لی۔ اور متوکل باللہ کے حکم نامے اور اس پر امام احمد بن حنبل کے جوابات معروف ہیں۔"

③ شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

وَهَذِهِ الشُّرُوطُ قَدْ ذَكَرَهَا أَئِمَّةُ الْعُلَمَاءِ مِنْ أَهْلِ الْمَذَاهِبِ الْمَتْبُوعَةِ وَغَيْرِهَا فِي كُتُبِهِمْ وَاعْتَمَدُوهَا؛ فَقَدْ ذَكَرُوا أَنَّ عَلَى الْإِمَامِ أَنْ يُلْزِمَ أَهْلَ الذِّمَّةِ بِالتَّمَيُّزِ عَنِ الْمُسْلِمِينَ فِي لِبَاسِهِمْ وَشُعُورِهِمْ وَكُنَاهُمْ وَرُكُوبِهِمْ: بِأَنْ يَلْبَسُوا أَثْوَابًا تُخَالِفُ ثِيَابَ الْمُسْلِمِينَ: كَالْعَسَلِيِّ وَالْأَزْرَقِ وَالْأَصْفَرِ وَالْأَدْكَنِ وَيَشُدُّوا الْخِرَقَ فِي قَلَانِسِهِمْ وَعَمَائِمِهِمْ وَالزَّنَانِيرَ فَوْقَ ثِيَابِهِمْ. وَقَدْ أَطْلَقَ طَائِفَةٌ مِنَ الْعُلَمَاءِ أَنَّهُمْ يُؤْخَذُونَ بِاللُّبْسِ وَشَدِّ الزَّنَانِيرِ جَمِيعًا وَمِنْهُمْ مَنْ قَالَ: هَذَا يَجِبُ إِذَا شُرِطَ عَلَيْهِمْ. وَقَدْ تَقَدَّمَ اشْتِرَاطُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ - رَضِيَ اللهُ عَنْهُ - ذَلِكَ عَلَيْهِمْ جَمِيعًا حَيْثُ قَالَ: وَلَا يَتَشَبَّهُوا بِالْمُسْلِمِينَ فِي شَيْءٍ مِنْ لِبَاسِهِمْ فِي قَلَنْسُوَةٍ وَلَا غَيْرِهَا: مِنْ عِمَامَةٍ وَلَا نَعْلَيْنِ. إِلَى أَنْ قَالَ: وَيُلْزِمُهُمْ بِذَلِكَ حَيْثُ مَا كَانُوا وَيَشُدُّوا الزَّنَانِيرَ عَلَى أَوْسَاطِهِمْ. وَهَذِهِ الشُّرُوطُ مَا زَالَ يُجَدِّدُهَا عَلَيْهِمْ مَنْ وَفَّقَهُ اللهُ تَعَالَى مِنْ وُلَاةِ أُمُورِ الْمُسْلِمِينَ كَمَا جَدَّدَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ - رَحِمَهُ اللهُ - فِي خِلَافَتِهِ وَبَالَغَ فِي اتِّبَاعِ سُنَّةِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ - رَضِيَ اللهُ عَنْهُ - حَيْثُ كَانَ مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَدْلِ وَالْقِيَامِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ بِمَنْزِلَةٍ مَيَّزَهُ اللهُ تَعَالَى بِهَا عَلَى غَيْرِهِ مِنَ الْأَئِمَّةِ وَجَدَّدَهَا هَارُونُ الرَّشِيدُ وَجَعْفَرٌ الْمُتَوَكِّلُ وَغَيْرُهُمَا[1]

"ان شرطوں کو معروف مسالک کے نامور امام علما نے اپنی کتب میں بیان کر کے ان پر اعتماد کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ حاکم کو غیر مسلموں کو پابند کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کے لباس، حجامت، کنیتیں، سواریوں میں ان سے جدا رہیں۔ اور ایسے کپڑے پہنیں جو مسلمانوں کے کپڑوں سے مختلف ہوں۔ جیسے شہدی، نیلا، زرد، سیاہی مائل رنگ اور اپنی ٹوپیوں، عماموں اور جنیو (کمر پٹی) پر اپنے کپڑوں کے اوپر سرخ چیتھڑے لگائیں۔ اور علما کی ایک جماعت نے خلط ملط ہونے اور جنیو باندھنے پر ان کو سزا دینے کا موقف بھی اختیار کیا ہے۔ اور دوسروں کا خیال ہے کہ اگر ایسا کرنا شرط معاہدہ میں داخل ہو تب ہو سکتا ہے۔ اور سیدنا عمر کی ان پر عائد کردہ یہ ساری شرطیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ جب انہوں نے کہا کہ غیر مسلم، مسلمانوں کے ٹوپی، عمامہ اور جوتے وغیرہ تک پہننے میں مشابہت نہیں کر سکتے۔ یہاں

---

[1] أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية، مجموع فتاوى ابن تيميه: ٢٨/٦٥٤، مجمع ملك فهد، المدينه الطيبة، ١٩٩٥م

تک کہہ دیا کہ وہ جہاں بھی ہوں، تو حاکم ان سے اس کی پابندی کرائے گا اور وہ اپنے درمیان میں پٹکا باندھیں گے۔ اور اللہ کی توفیق سے بہرہ مند مسلم حکمران ہر دور میں ان شرطوں کی تجدید کرتے رہے ہیں۔ حتی کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور خلافت میں اس کو پختہ کیا اور سیدنا عمر بن خطاب کی اتباع کی سنت کو مستحکم کیا۔ کیونکہ آپ علم، عدل، قرآن و سنت کی اتباع میں دیگر خلفا کی بہ نسبت ممتاز مقام پر فائز تھے۔ اور ان شرائط کو خلفاے عباسیہ: ہارون الرشید اور جعفر و متوکل باللہ نے بھی دوبارہ تازہ و تجدید کیا۔"

④ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے دور میں غیر مسلموں کی شناخت کا مسئلہ عملاً بھی پیش آیا۔ یہ پورا واقعہ ان کے شاگرد حافظ ابن قیم جوزیہ نے بیان کیا اور اس کے بعض حصے فتاوی ابن تیمیہ میں بھی مذکور ہیں۔ ابن قیم بتاتے ہیں کہ جب حاکم وقت نے غیر مسلموں کو عمامے بدلنے اور مسلمانوں سے مختلف رنگ پہننے کا حکم دیا تو اس سے غیر مسلموں پر قیامت ٹوٹ پڑی کہ معاشرے میں ان کا تشخص نمایاں ہونے لگا۔ تب شیطان نے انہیں یہ تدبیر سجھائی کہ ایک فتویٰ کی صورت میں یہ مسئلہ اہل علم سے پوچھ کر اس تشخص و امتیاز کا خاتمہ کیا جائے۔[1] فتوی کا متن یوں ہے:

مَا تَقُولُ السَّادَةُ الْعُلَمَاءُ: فِي قَوْمٍ مِنْ أَهْلِ الذِّمَّةِ أُلْزِمُوا بِلِبَاسٍ غَيْرِ لِبَاسِهِمُ الْمُعْتَادِ وَزِيٍّ غَيْرِ زِيِّهِمُ الْمَأْلُوفِ وَذَلِكَ أَنَّ السُّلْطَانَ أَلْزَمَهُمْ بِتَغْيِيرِ عَمَائِمِهِمْ وَأَنْ تَكُونَ خِلَافَ عَمَائِمِ الْمُسْلِمِينَ فَحَصَلَ بِذَلِكَ ضَرَرٌ عَظِيمٌ فِي الطُّرُقَاتِ وَالْفَلَوَاتِ وَتَجَرَّأَ عَلَيْهِمْ بِسَبَبِهِ السُّفَهَاءُ وَالرِّعَاعُ وَآذَوْهُمْ غَايَةَ الْأَذَى وَطَمِعَ بِذَلِكَ فِي إِهَانَتِهِمْ وَالتَّعَدِّي عَلَيْهِمْ. فَهَلْ يَسُوغُ لِلْإِمَامِ رَدُّهُمْ إِلَى زِيِّهِمُ الْأَوَّلِ وَإِعَادَتِهِمْ إِلَى مَا كَانُوا عَلَيْهِ مَعَ حُصُولِ التَّمْيِيزِ بِعَلَامَةٍ يُعْرَفُونَ بِهَا؟ وَهَلْ ذَلِكَ مُخَالِفٌ لِلشَّرْعِ أَمْ لَا؟[2]

"حضرات علماء و مفتیان کیا فرماتے ہیں کہ حاکم وقت نے غیر مسلموں کو ان کے روزمرہ لباس اور مروجہ اطوار کو چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ کہ حاکم نے ان کو اپنے عمامے بدلنے اور مسلمانوں کے عماموں سے مختلف کرنے کا پابند کیا ہے۔ اس سے راستوں اور بیابانوں کے سفر میں بہت سی مشکلات رونما ہو گئی ہیں۔ اور اس کے سبب کم عقل اور رذیل لوگ نے غیر مسلموں کو بے پناہ تکلیف دینا اور ذلیل کرنا شروع کر دیا ہے۔ کیا ممکن ہے کہ حاکم انہیں پہلی عادات و اطوار پر پلٹنے کی اجازت دے دے اور اس کی کوئی ایسی علامت رکھ دے جس سے ان کی پہچان ہو جائے۔ اور کیا ایسا کرنا مخالفِ شرع ہے یا

---

۱ إعلام الموقعين: ٤ / ١٩٣، دار الكتب العلمية، بيروت ١٤١١ھ

۲ مجموع فتاوى ابن تيمية: ٦٥٨/٢٨، مجمع ملك فهد، المدينه الطيبة، ١٩٩٥م

نہیں؟" حافظ ابن قیم پھر بتاتے ہیں کہ

فَأَجَابَهُمْ مِنْ مَنَعِ التَّوْفِيقِ وَصَدَّ عَنْ الطَّرِيقِ بِجَوَازِ ذَلِكَ وَأَنَّ لِلْإِمَامِ إِعَادَتَهُمْ إِلَى مَا كَانُوا عَلَيْهِ. قَالَ شَيْخُنَا: فَجَاءَتْنِي الْفَتْوَى. فَقُلْتُ: لَا تَجُوزُ إِعَادَتُهُمْ وَيَجِبُ إِبْقَاؤُهُمْ عَلَى الزِّيِّ الَّذِي يَتَمَيَّزُونَ بِهِ عَنْ الْمُسْلِمِينَ. فَذَهَبُوا ثُمَّ غَيَّرُوا الْفُتْيَا ثُمَّ جَاءُوا بِهَا فِي قَالَبٍ آخَرَ فَقُلْتُ: لَا تَجُوزُ إِعَادَتُهُمْ. فَذَهَبُوا ثُمَّ أَتَوْا بِهَا فِي قَالَبٍ آخَرَ فَقُلْتُ: هِيَ الْمَسْأَلَةُ الْمُعَيَّنَةُ وَإِنْ خَرَجَتْ فِي عِدَّةِ قَوَالِبَ. قَالَ ابْنُ الْقَيِّمِ: ثُمَّ ذَهَبَ شَيْخُ الْإِسْلَامِ إِلَى السُّلْطَانِ وَتَكَلَّمَ عِنْدَهُ بِكَلَامٍ عَجِبَ مِنْهُ الْحَاضِرُونَ فَأَطْبَقَ الْقَوْمُ عَلَى إِبْقَائِهِمْ. وَلِلَّهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.[1]

"بعض علمائے اللہ تعالیٰ کی توفیق نہ ملنے (بھٹکے لوگ) اور صراط مستقیم سے ہٹ جانے کی بناپر اس کو جائز قرار دے دیا کہ حاکم انہیں سابقہ (مشترک) عادات واطوار پر پلٹنے کی اجازت دے دے۔ تو میرے استاد (ابن تیمیہ) کے پاس جب بعض علما کا یہ فتویٰ پہنچا تو آپ نے جواب دیا کہ ان کو مشترک عادات پر لوٹنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور انہیں ایسے اطوار کو ہی اپنانا ہو گا جس سے وہ مسلمانوں سے جدا نظر آئیں۔ غیر مسلم چلے گئے، پھر فتویٰ کی عبارت بدل کر لائے تو میں نے پھر کہا کہ ہرگز جائز نہیں۔ پھر وہ سوال کی تیسری شکل بنا کر لائے، میں نے کہا: مسئلہ بالکل وہی رمتعین ہے، اگرچہ اس کے متعدد قالب بنالئے جائیں۔ پھر ابن قیم کہتے ہیں: کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ حاکم کے پاس چلے گئے اور اس کو ایسے دلائل اور نصیحتیں کیں کہ سب درباری رحاضرین ششدر ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ حاکم نے غیر مسلموں کو ان امتیازی عادات پر باقی رکھا، الحمد للہ والمنہ۔"

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ "بہت سے مفتیان سوال کی ظاہری تبدیلی سے نفس مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں، اور بہت سے کسی دنیوی مفاد میں بہہ جاتے ہیں، مگر جن کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے[2]۔" لیکن مسئلہ کی اصل صورت کو پہچاننا اور اس کو دلائل وبراہین سے واضح کردینا، اور اس کے لئے حاکم کے دربار میں جاکر جدوجہد کرنا اور شریعتِ الٰہیہ کو نافذ کروانا اللہ تعالیٰ کی اپنے بعض بندوں پر خاص رحمت ہے۔

⑤ مفسر قرآن حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) نے اپنی مشہور تاریخ 'البدایہ والنہایہ' میں ساتویں صدی ہجری کے واقعات میں بیان کیا ہے:

وَفِي يَوْمِ الِاثْنَيْنِ قُرِئَتْ شروط الذمة على أهل الذمة وألزم بِهَا وَاتَّفَقَتِ الْكَلِمَةُ عَلَى

---

1 ایضًا

2 إعلام الموقعين: ۱/۱۴۲، دار الكتـ

عزلهم عن الجهات، وأخذوا بالصغار، ونودي بذلك في البلد وألزم النصارى بالعمائم الزرق، واليهود بالصفر، والسامرة بالحمر، فحصل بذلك خير كثير وتميزوا عن المسلمين.

"سوموار کو غیر مسلموں کی شرائط کو اُن پر پڑھ کر سنایا گیا، اور اُنہیں ان کا پابند کیا گیا۔ اور ذمہ دار مناصب سے ان کی معزولی پر موقف پختہ ہو گیا اور انہیں ماتحت ہونا پڑا۔ شہر میں اس کی منادی کی گئی، اور عیسائیوں کو نیلے عماموں، یہود کو زرد عماموں اور یہودی فرقے سامرۃ کو سرخ عماموں کا پابند کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ بڑی خیر پھیلی اور وہ مسلمانوں سے جدا ہو گئے۔"

⑥ حافظ ابن کثیر کے دور ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء میں شروطِ عمریہ نافذ تھیں۔ جیسا کہ محمد جمال شوربجی لکھتے ہیں:

نصت الشروط العمرية في صيغتها التي كُتبت بها في عام 700هـ/ 1300م أيام السلطان الناصر محمد بن قلاوون على "أن لا يحدثوا في البلاد الإسلامية وأعمالها ديرًا ولا كنيسة ولا صومعة، ولا يجدد منها ما خرب، ولا يمنعوا أن ينزل عليهم أحد من المسلمين ثلاث ليال يطعمونه، ولا يكتموا غشاً للمسلمين، ولا يعلموا أولادهم القرآن، ولا يمنعونهم من الإسلام إذا أرادوا، وإن أسلم أحدهم لا يؤذوه، ولا يتشبهوا بشيء من ملابس المسلمين، ويلبس النصراني من العمامة الزرقاء ثلاثة أذرع فما دونها، واليهودي العلامة الزرقاء كذلك، وتمنع نساؤهم من التشبه بنساء المسلمين، ولا يتسموا بأسماء المسلمين وألقابهم، ولا يركبوا الخيل والبغال، ويسمح لهم بركوب الحمير من دون زينة، ولا ينقشوا خواتمهم بالعربية، ولا يدخلوا الحمام إلا بعلامة تميزهم في عنقهم من حديد أو نحاس أو غير ذلك، ولا يستخدموا مسلماً في أعمالهم، ولا يعلوا بناء قبورهم، ولا يعلوا في البناء على بناء المسلمين، ولا يضربوا بالناقوس إلا ضرباً خفيفاً، ولا يرفعوا أصواتهم في كنائسهم، ولا يشتروا من الرقيق مسلماً ولا مسلمة، ولا يمشوا وسط الطريق توسعة للمسلمين، ولا يفتنوا مسلماً عن دينه، ولا يدلوا على عورات المسلمين، ومن زنى بمسلمة قتل، وكل من مات من اليهود والنصارى والسامرة في سائر المملكة يحتاط ديوان المواريث الحشرية على ماله إلى أن يثبت ورثته ما يستحقونه وفق الشرع الحنيف، فإذا استحق يعطونه بمقتضاه وينقل الباقي إلى بيت المال،

ومن مات ولا وارث له يحمل تركته إلى بيت المال شأنهم في ذلك شأن المسلمين."[1]

"جو شروط عمریہ ۷۰۰ھ/۱۳۰۰ء میں سلطان ناصر محمد بن قلاوون کی طے کردہ شرائط میں لکھا گیا کہ وہ بلادِ اسلامیہ اور اس کے کاموں میں کوئی گرجا، کنیسہ اور معابد نہیں بنائیں گے۔ جو خراب ہو گیا، اس کی تجدید نہ کریں گے، اور مسلمانوں کو اس سے نہ روکیں گے کہ وہ ان کے ہاں تین دن تک بطور مہمان قیام کریں، اور دھوکہ دیتے ہوئے مسلمانوں سے کچھ نہیں چھپائیں گے۔ اور اپنے بچوں کو قرآن نہیں پڑھائیں گے۔ اور اگر وہ اسلام لانا چاہیں تو انہیں نہیں روکیں گے۔ اگر کوئی اسلام لے آئے تو اس کو اذیت رسانی نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کے ملبوسات جیسے کپڑے نہیں پہنیں گے۔ اور عیسائی تین ہاتھ یا اس سے کم عمامہ پہنے گا۔ اور یہودیوں کی بھی ایسی ہی نیلی علامت ہو گی۔ اور ان کی عورتیں مسلمان عورتوں سے مشابہت نہیں کریں گی۔ وہ مسلمانوں جیسے نام اور القاب نہیں رکھیں گے۔ وہ گھوڑے اور خچر پر سوار نہیں ہوں گے۔ تاہم گدھے پر بلا آرائش کے سواری کرنے کی اجازت ہے۔ وہ اپنی انگوٹھیوں میں عربی نقش نہ کروائیں گے۔ اور وہ حمام میں اس وقت تک نہیں جائیں گے جب تک ان کے گلے میں لوہے، تانبے وغیرہ جیسی کوئی علامت ہو۔ اپنے کاموں میں مسلمانوں کو مزدوری پر نہیں رکھیں گے۔ اور اپنی قبریں بلند نہیں کریں گے۔ اپنے گھر مسلمانوں سے بلند نہیں بنائیں گے۔ اور گھنٹیاں صرف آہستہ آواز میں ہی بجا سکتے ہیں۔ اور اپنے کلیساؤں میں آوازیں بلند نہیں کریں گے۔ اور ایسا غلام نہیں خریدیں گے جو مسلمان مرد یا عورت ہو۔ اور مسلمانوں کے لئے راستہ چھوڑتے ہوئے، درمیان میں نہیں چلیں گے۔ اور مسلمانوں کے دین میں کوئی فتنہ / آزمائش پیدا نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کے مخفی اُمور کی نشاندہی نہیں کریں گے۔ اور جس نے مسلمان عورت سے زنا کیا تو اس کی سزا قتل ہے۔ اور یہود و نصاریٰ اور (یہودی فرقہ) سامرۃ میں سے جو پوری مملکت میں کہیں فوت ہو جائے تو 'وراثتیں جمع کرنے کا ادارہ' یہ انتظام کرے گا کہ شرعِ اسلامی کے مطابق ہی ان کی وراثت تقسیم ہو۔ اگر ورثا (شرع کے مطابق وراثت کے) مستحق ہوئے تو انہیں اس کے مطابق حصہ ملے گا، اور باقی ماندہ بیت المال میں منتقل ہو جائے گا۔ اور ان میں سے جو بلا وارث فوت ہو جائے تو اس کا ترکہ دیگر مسلمانوں کی طرح بیت المال میں جمع کرا دیا جائے۔"

⑦ حافظ ابن حجر کے شاگرد نامور امام شمس الدین سخاوی شافعی (م ۹۰۲ھ) لکھتے ہیں:

وجمع قبله الشيخ شمس الدين ابن القيم الحنبلي مجلدًا حافلاً في شروط أهل الذمة

1 http://www.alhayat.com/article/869011, dated: 10th Jan, 2019.

وأحكامهم ينتفع به وكذا لشيخه التقي ابن تيمية عدة تآليف وفتاوى في آخرين، اجتمع عندي منها جملة "كشروط أهل الذمة" للحافظ أبي الشيخ ابن حيان و"الإيضاح والبيان" للشيخ أبي عبد الله ابن النعمان المالكي و"استعمال أهل الذمة" لأبي أمامة ابن النقاش الشافعي، و"إلزام أهل الذمة بالشروط العمرية" أظنه للعماد ابن كثير الحافظ، ومصنف للحافظ ابن زبر، ولو أردت البسط في هذه المسألة لكان مجلدًا حافلاً، لكن الوقت أضيق عن الاشتغال بما هو معلوم، مقرر، مفهوم، على أن لي جزءًا لطيفًا جمعته حين رام الظاهر جقمق رحمه الله إلزام أهل الذمة بالشروط العمرية، سميته "القول المعهود فيما على أهل الذمة من العهود" ثم إن اليهود الكذبة الخونة زعموا في أيام الظاهر جقمق رحمه الله في مكان بحارة رويلة كان معدًا لتعليم أطفالهم، والسكنى به، يعرف بدار ابن شميخ أنه كنيسة، فقام المسلمون في صرفهم عن ذلك، واثبتوا على نائب القاضي الحنفي وغيره، أن الدار المشار إليه، مستحقة لبيت المال المعمور بحكم أن ابن سميح المذكور هلك، ولم يعقب، ولم يترك من يحجب بيت المال عن استحقاقها، سفلاً وعلوا وأن رؤساء اليهود القرابين، ومشايخهم يتداولون وضع أيديهم عليها خلفًا عن سلف بغير طريق شرعي، وسر المسلمون بذلك سرورًا كبيرًا۔[1]

"اس سے قبل شیخ شمس الدین ابن قیم حنبلی نے اہل ذمہ کی شرائط واحکام پر ایک بھرپور جلد لکھی ہے، جس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی ان کے استاد ابن تیمیہ نے متعدد تالیفات اور دیگر فتاویٰ میں بھی لکھا ہے۔ یہ سب چیزیں میرے پاس

شروط اہل الذمہ	از حافظ ابو شیخ ابن حیان
الایضاح والبیان	از شیخ ابو عبداللہ ابن نعمان مالکی
استعمال اہل الذمہ	از ابو امامہ ابن نقاش شافعی
الزام اہل الذمہ بالشروط العمریہ	از حافظ عماد الدین ابن کثیر غالباً
اور مصنف	از ابن زبر نامی کتب

کی صورت میں جمع ہیں۔ اگر میں تفصیل سے انہیں قلم بند کروں تو ایک کامل جلد بن جائے۔ لیکن میری معلوم وطے شدہ اور سمجھ میں آنے والی مصروفیات ر تنگی وقت کی وجہ سے، میں نے ایک مختصر

---

1 محمد بن عبد الرحمٰن السخاوی، الأجوبة المرضية فيما سئل السخاوي عنه من الأحاديث النبوية: ۳/۱۰۲۷، دار الرایہ للنشر، ۱۴۱۸ھ

جزء پر ہی اکتفا کیا ہے۔ جس کو میں نے اس وقت لکھا جب سلطان ظاہر حشقدم نے اہل ذمہ کو شروط عمریہ کا پابند کیا، اس کا نام میں نے القول المعهود فيما على أهل الذمة من العهود رکھا ہے۔ پھر جھوٹے خائن یہودیوں نے سلطان ظاہر جقمق کے دور میں قرب سمندر ایک وسیع عمارت پر قبضہ کرنا چاہا جو بچوں کی تعلیم اور قیام کے لئے تعمیر ہوئی تھی۔ لوگوں میں وہ دار ابن شیخ کے نام سے مشہور تھی کہ وہ ایک گرجا ہے۔ تو مسلمانوں نے یہودیوں سے اسے واپس لینے کی جدوجہد کی۔ اور حنفی نائب قاضی کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ مذکورہ عمارت بیت المال کی ملکیت ہونی چاہیے۔ کیونکہ ابن شیخ مذکور مر چکا ہے اور اس کا کوئی وارث نہیں ہے۔ اور اس نے نیچے یا اوپر ایسی کوئی رکاوٹ نہیں چھوڑی جو بیت المال کو اس کی ملکیت سے روکتی ہو۔ اور قریبی یہودی اور ان کے بزرگ اس کو بلا کسی معقول بنیاد کے ہتھیانے کی کوشش میں ہیں۔ سو اس فیصلہ سے مسلمان بے پناہ خوش ہوئے۔"

⑧ محمود زیبادی لبنانی روزنامہ 'النہار' میں اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

... يختصر العلامة السرياني أبو الفرج جمال الدين بن العبري هذا التحول في كتابه "تاريخ الزمان" حيث يقول: "تمادى في بغض المسيحيين حتى اضطرهم أن يتعمموا بعمائم صوف وأن لا يخرجوا خارجاً وأن لا يتزينوا بزنار وكستيج، ومن كان له عبد ألزمه أن يخيط على قميصه من قدّام ومن خلف رقعة لونها غير لون القميص .وأن تُقوّض الكنائس الحديثة البناء. وإذا كان للنصارى كنيسة واسعة ولو قديمة وجب أن يؤخذ جانب منها ويُجعل مسجداً. وأن لا يطوفوا بالصلبان في احتفالاتهم

بحسب تاريخ الطبري، أصدر المتوكل هذه الأوامر في عام 235 للهجرة، وتبدو صيغة ابن العبري ملطّفة، مقارنةً بالنص الأصلي المطوّل الذي نقله الطبري.

یہ 'امتیاز پر مبنی احکامات' تاریخ کے بعض عہدوں میں پائے گئے ہیں۔ جن سب میں مشہور ترین وہ زمانہ ہے جو خلیفہ متوکل کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب عباسی مملکت زوال اور کمزوری کا شکار ہو گئی۔ نویں صدی کے نصف میں متوکل حکومت پر متمکن ہوا، اور معتزلہ کا اس نے ناطقہ بند کیا، امام احمد بن حنبل کو آزاد کر دیا اور ان سے ظلم کو دور کیا۔

علامہ سریانی ابو الفرج جمال الدین بن عبری نے اس تغیر کو اپنی کتاب 'تاریخ الزمان' میں مختصر طور پر یوں بیان کیا ہے کہ اس نے عیسائیوں سے نفرت میں حد سے تجاوز کرتے ہوئے ان کو مجبور کیا کہ وہ اونی عمامے پہنا کریں، باہر مت نکلا کریں، وہ پٹکا اور کستیج (ایسی کپڑوں کے اوپر لگائی جانے والی

ایک انگلی کے برابر موٹی پٹی رزنار جو کپڑے یا روئی سے بنی ہو) کی زینت استعمال نہیں کر سکتے۔ اور جس کا کوئی غلام ہو تو وہ اس کو قمیص پر اس کے رنگ سے مختلف، پٹی آگے سے پیچھے تک باندھا کرے۔ اور نئے بننے والے کلیساؤں کو گرا دیا جائے۔ اگر عیسائیوں کا کوئی وسیع کلیسا ہو، چاہے قدیم سے چلا آرہا ہو تو ضروری ہے کہ اس کی جانبی جگہ لے کر وہاں مسجد بنائی جائے۔ متوکل نے یہ احکام ۲۳۵ھ میں جاری کئے۔ اور ابن عبری کے الفاظ کا اگر امام طبری کے مفصل اور اصلی متن سے مقابلہ کیا جائے تو وہ قدرے نرم نظر آتے ہیں۔"

⑨ محمود زیادی لبنان کے اخبار 'النہار' میں مزید لکھتے ہیں:

في الأزمنة الحديثة، نقع على ما يُشبه ذلك في القرن التاسع عشر، أي في زمن أقول العهد العثماني. في كتابه "جسر اللثام عن نكبات الشام"، يخبرنا شاهين مكاريوس أن والي دمشق محمد درويش أصدر في العشرين من شهر حزيران 1821 مرسومًا إلى مشايخ أهالي قرية صيدنايا المسلمين "ليجروا بحسبه ويعتمدوه." يقول هذا المرسوم إن النصارى قلّدوا المسلمين "في ملابسهم وعمائمهم ونعالهم وتعدّوا درجاتهم وخالفوها، فهذا ضد رضانا، ولا يعطى به رخصة، فبناء على ذلك أرسلنا لكم مرسومنا هذا لأجل أن تحذروهم وتنذروهم من عواقب ذلك المراد حالاً وتنبهوا عليهم ألّا يلبسوا ملبوسًا أرزق وعمامة سوداء ونعالا سودا، ولا تدعوهم يقلدوا الإسلام بأدنى شيء، لا نساء ولا رجالا، وإن بلغنا أن واحدا تعدّى الحدود المذكورة فما له أن يُغنى عن حاله، وخطيئته في عنقه."[1]

"تازہ دور میں، ہم انیسویں صدی عیسوی میں اس کے قریب قریب دیکھتے ہیں، یعنی جس کو میں عہد عثمانی کہہ سکتا ہوں۔ تو شاہین مکاریوس اپنی کتاب جسر اللثام عن نکبات الشام میں لکھتے ہیں کہ حاکم دمشق محمد درویش نے جون ۱۸۲۱ء میں قصبہ صیدنایا کے مسلمان بزرگوں کے نام ایک حکم نامہ جاری کیا کہ وہ اس کے مطابق چلیں، اس پر ہی انحصار کریں۔

یہ حکم نامہ قرار دیتا ہے کہ عیسائیوں نے مسلمانوں کے ملبوسات، عماموں اور جوتوں کی نقالی شروع کر دی ہے۔ اور اپنے مقام سے تجاوز کر کے ان شرطوں کی مخالفت کی ہے، تو یہ چیز ہماری رضا کے مخالف ہے۔ اس کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ بایں وجہ میں یہ حکم نامہ آپ کو بھیج رہا ہوں کہ آپ ان کو روکیں اور اس کے انجام بد سے ڈرائیں اور انہیں خبردار کر دیں کہ وہ نیلا لباس، سیاہ عمامہ یا سیاہ جوتے

1 https://newspaper.annahar.com/article/114390

مت پہنیں۔ اور ان کے مرد وزن کو کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی مسلمانوں کی نقالی نہ کرنے دیں۔ اگر ہمیں پتہ چلا کہ کسی نے بھی مذکورہ شرائط کی خلاف ورزی کی ہے تو اسے اپنے بارے میں بے پروا نہیں ہونا چاہئے اور اس کی غلطی کا وبال اس کی گردن پر ہوگا۔"

شروطِ عمریہ پر عمل کا جدول... مسلم تاریخ کے آئینے میں

دور	خلیفہ / حاکم	مصنف	کتاب
۱۶ھ / ۶۳۷ء	خلیفہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ	ابن زبر، بیہقی	مسند احمد، سنن کبریٰ
۳۰ھ / ۶۵۱ء	خلافتِ راشدہ ومابعد	ابن تیمیہ	فتاوی ابن تیمیہ
۱۰۰ھ / ۷۱۸ء	سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ	ابن قیم	احکام اہل الذمہ
۱۸۵ھ / ۸۰۲ء	خلیفہ ہارون الرشید	ابن تیمیہ	فتاوی ابن تیمیہ
۲۳۵ھ / ۸۵۰ء	خلیفہ جعفر بن محمد المتوکل باللہ	ابن تیمیہ	تاریخ طبری
۶۸۰ھ / ۱۲۸۰ء	حاکم کے دربار میں شیخ ابن تیمیہ نے مناظرہ کیا		فتاوی ابن تیمیہ
۷۰۰ھ / ۱۳۰۰ء	سلطان الناصر محمد بن قلاوون	حافظ ابن کثیر	البدایہ والنہایہ
۹۰۰ھ / ۱۴۹۵ء	الظاہر حشقدم / الظاہر جقمق	شمس الدین سبکی	فتاویٰ سبکی
۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۱ء	حاکم دمشق: محمد درویش	محمود زیباوی	لبنانی اخبار 'النہار'

خلاصہ بحث

مذکورہ بالا تفصیلات سے علم ہوتا ہے کہ شروط عمریہ اور عہد عمریہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور غیر مسلموں کے لئے ان شرائط کی پاکستان جیسے ملک میں خاص اہمیت ہے۔ یہ شرائط کتب حدیث میں بیان ہوئی ہیں، اور ان کی دسیوں اسانید کی وجہ سے انہیں مستند سمجھا جاتا ہے۔ نیز ان پر صحابہ کرام کے اجماع کا دعویٰ بہت سے علما نے کیا ہے۔ تاریخ اسلامی کے نامور مسلم حکام نے بھی ان شرائط کو ہر دور میں، کم وبیش ۱۲ صدیوں تک مسلم معاشروں میں قائم اور نافذ رکھا ہے۔ ☆☆

زیر نظر مضمون میں تفصیل کے ساتھ شروطِ عمریہ کی وضاحت، آثار، روایات کی تحقیق، اور مختلف ادوار میں اس کے نفاذ کی تاریخی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ آئندہ ایک مستقل مضمون میں شروط عمریہ کے بارے میں جملہ فقہی مذاہب کے فقہائے کرام کے اقوال اور ان شرائط کی شرعی اساسات (ایسی احادیث وآثار جن کی بنا پر یہ شرائط قائم کی گئیں)، معنویت، حکمتیں، اور قابل ذکر شرائط کو اصل اسلامی مراجع سے بیان کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

منصبِ امامت؛ سیرتِ نبویہ کی روشنی میں

محمد نعمان فاروقی
مدیر ماہنامہ ضیاے حدیث، لاہور

مسلمانوں کی عملی زندگی میں سب سے زیادہ اور عبادات میں سے اہم اور مسلسل ادا کی جانے والی عبادت نماز ہے۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کو اپنی عبادات میں بہت زیادہ واسطہ ائمہ کرام سے رہتا ہے۔ کیونکہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ہم نے بچے کے کان میں اذان، پھر نکاح اور نماز جنازہ بھی ائمہ کے سپرد کیا ہوا ہے۔ جس قدر ائمہ کرام کی ضرورت زیادہ ہے، اسی قدر ائمہ اور ان کے نمازیوں میں فاصلے بھی زیادہ ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے شکایت کناں رہتے ہیں۔ نماز لمبی یا چھوٹی ہونے، نمازوں کے اوقات بدلنے، مسجد کی صفائی اور انتظام کے معاملات اور نماز کے اندر پیش آجانے والے مسائل میں شکر رنجیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ اور بعض اوقات یہ بہت طول پکڑ لیتی ہیں، چنانچہ ان کے تصفیے کے ساتھ ساتھ اخلاص، للہیت اور بے لوث خدمت کی بھی ضرورت ہے اور امام کے مقام و مرتبہ سے شناسائی بھی ضروری ہے۔

ایک مضمون میں تمام معاملات کے تجزیے کی تو شاید گنجائش نہیں، مگر رسولِ اکرم ﷺ کی اس حیثیت کو پیش کر کے عوام اور ائمہ کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جاسکتا ہے تاکہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر دونوں میں فاصلے اور دوریاں کم کی جائیں۔

نبی کریم ﷺ کی امامت

جب سے نماز کا آغاز ہوا، نبی کریم ﷺ نے زندگی کے آخری لمحات تک چند نمازوں کے سوا تمام نمازوں کی امامت خود فرمائی۔ اِکّا دُکّا واقعات ہیں جس میں آپ مقتدی بنے۔ اس کے باوجود آپ جس طرح امامت کی خوبیوں سے آگاہ کرتے تھے، ویسے ہی نمازیوں کی ضروریات کا بھی خیال رکھتے تھے۔ آپ ﷺ مقتدی حضرات کی ضروریات واحساسات سے بھی آشنا تھے۔

آپ ﷺ نے فرض نمازوں کی سفر اور حضر دونوں حالتوں میں امامت بھی کرائی، جنازے بھی پڑھائے، نمازِ تراویح بھی پڑھائی، نمازِ عید بھی پڑھاتے تھے، نمازِ استسقا بھی پڑھائی اور نمازِ کسوف اور خسوف یعنی سورج گرہن اور چاند گرہن کی نمازیں بھی پڑھائیں۔ اس طرح آپ نے اُمت کے ائمہ کرام کے لیے بہترین راہ

نمائیاں فرمائیں اور مقتدی حضرات کو بھی ائمہ کی عزت اور وقار کا پورا درس دیا۔ دونوں کو ان کے حقوق وفرائض سے آشنا کر کے ایک بڑا ہی پاکیزہ اور روحانی رشتہ قائم کر دیا۔

منصبِ امامت کا تعلق چونکہ مقتدی حضرات سے ہے، یعنی مقتدی ہوں گے تو امام ہوں گے۔ اس لیے یہ منصب کسی بھی امام کی محض اپنی قابلیت کے بل بوتے پر نہیں چل سکتا۔ لہٰذا سیرت نبویہ کی روشنی میں ہم سب مل جل کر امامت اور اقتدا سے جڑے اس رشتے کو قابل رشک بنا سکتے ہیں۔ ذیل میں ایک تسلسل سے امامت کی خوبیوں اور مقتدیوں کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

نبی ﷺ جماعت کروانے کے لیے کب آتے تھے؟

نبی کریم ﷺ مسجد میں عموماً اس وقت تشریف لاتے جب نمازی نفل پڑھ کر بیٹھ جاتے۔ کیونکہ نفل پڑھے بغیر مسجد میں بیٹھنے سے آپ ﷺ نے انھیں منع کیا ہوا تھا۔ فرمایا:

«إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلاَ يَجْلِسْ حَتَّى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ»[1]

"تم میں سے جب کوئی مسجد آئے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعات پڑھ لے۔"

اسی لیے آپ ﷺ نے ان کے لیے ایک ضابطہ مقرر فرما دیا تھا کہ «لَا تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي» "تم جب تک مجھے (مسجد آتا) دیکھ نہ لو، تب تک (صفوں کی درستگی) کے لیے کھڑے نہ ہوا کرو۔" نمازیوں سے مسجد بھری ہو اور ایک دم صف بندی کرنی پڑے تو بھگدڑ سی مچ جاتی ہے۔ اس سے بچانے کے لیے آپ ﷺ نے ساتھ یہ بھی فرما دیا: «وَعَلَيْكُمُ السَّكِينَةَ» "(مجھے دیکھ کر کھڑے ہونے پر) آہستگی اور سکون کا اہتمام کیا کرو۔"[2]

نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام تھے۔ نمازی مسجد میں جمع تھے۔ اس دوران سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے جا کر آپ ﷺ کو نماز کی اطلاع دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «مُرُوا أَبَابَكْرٍ فَلْيُصَلِّ»[3] "ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔" اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلے جمع ہو جاتے تھے اور آپ ﷺ نماز پڑھانے کے لیے بعد میں آتے تھے۔

لہٰذا مقتدی حضرات کو چاہیے کہ وہ ائمہ کا انتظار کر لیا کریں۔ انھیں بھی مصروفیات یا عوارضات لاحق

---

۱ صحيح البخاري، كِتَابُ الصَّلاَةِ، بَابُ إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ المَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ: ۴۴۴

۲ صحيح البخاري، كِتَابُ الجُمُعَةِ، بَابُ المَشْيِ إِلَى الجُمُعَةِ: ۹۰۹

۳ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ الرَّجُلُ يَأْتَمُّ بِالإِمَامِ وَيَأْتَمُّ النَّاسُ بِالمَأْمُومِ: ۷۱۳

ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں نماز کے وقت سے ایک سیکنڈ بھی اوپر ہو جائے تو بے چارے امام کی خیر نہیں۔ لوگوں کی نظریں گھڑی اور امام کی تلاش میں لگ جاتی ہیں اور بڑے بڑے پارسا انسانوں کی زبانوں کے بند ھن کھل جاتے ہیں۔ عہد نبوی میں تو صحابہ رضی اللہ عنہم بعض اوقات جماعت کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سو جایا کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ یہ آداب امامت نہیں بلکہ آداب رسالت تھے تو اپنے موقف کی دلیل اس کے ذمہ ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے محو گفتگو ہو جاتے تو؟

کبھی ایسا بھی ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو کوئی آپ سے گفتگو کرنے لگ جاتا۔ آپ اس کی بات پوری توجہ سے سنتے، حالانکہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہوتی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: نماز کی اقامت ہو گئی تھی۔ ایک شخص آپ کے سامنے آ گیا اور گفتگو کرنے لگا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھانے سے روکے رکھا۔[1] اس کی بات لمبی ہوتی گئی حتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (بیٹھے بیٹھے) سونے لگے۔[2]

ہمارے یہاں اپنے آپ کو متبع سنت کہلوانے والوں کی عمومی صورت حال یہ ہے کہ اگر امام کسی کے سوال کا جواب دے رہا ہے یا صفیں سیدھی کراتے ہوئے کوئی حدیث سنا رہا ہے یا بالفرض وہ خود بھی گھڑی پر نظریں رکھے ہوئے ہے اور اس کی نظر چند لمحوں کے لیے گھڑی سے ہٹی اور ادھر سے ٹائم ہو گیا تو مسجد کے کسی کونے سے ایک زوردار اور بھدی سی آواز نمودار ہوتی ہے۔ "ٹائم ہو گیا ہے!!"

اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جماعت سے پہلے کوئی ضرورت پیش آ جاتی؟

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (مسجد میں) تشریف لائے۔ اقامت ہو چکی تھی اور صفیں برابر ہو چکی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مصلائے امامت پر تشریف لا چکے تھے، ہم تکبیر کے انتظار میں تھے کہ آپ یہ فرماتے ہوئے کہ "اپنی اپنی جگہ ٹھہرو۔" واپس تشریف لے گئے۔ اس دوران ہم اپنی اسی حالت پر رہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف آئے تو آپ نے غسل کیا ہوا تھا اور آپ کے سر مبارک سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔[3]

---

۱ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ الإِمَامِ يَعْرِضُ لَهُ الحَاجَةُ بَعْدَ الإِقَامَةِ: ۶۴۲

۲ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ الكَلاَمِ إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلاَةُ: ۶۴۳

۳ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ الإِمَامِ يَعْرِضُ لَهُ الحَاجَةُ بَعْدَ الإِقَامَةِ: ۶۴۲

۴ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابٌ هَلْ يَخْرُجُ مِنَ المَسْجِدِ لِعِلَّةٍ؟: ۶۳۹

صفیں سیدھی کرانے کا اہتمام

رسول اکرم ﷺ صفوں کو سیدھا کرانے اور فاصلے ختم کرانے کا پورا اہتمام کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ فرماتے:

«سَوُّوا صُفُوفَكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوفِ مِنْ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ.»[1]

"اپنی صفوں کو برابر کرلو کیونکہ صفوں کی برابری قیام نماز کا حصہ ہے۔"

یہ تو فرمان ہے، صفوں کی برابری کے حوالے سے جس پر سبھی متفق ہیں مگر دوسری احادیث میں فاصلوں کو ختم کرنے کی اور آپس میں ملنے کی واضح تعلیمات ہیں، حدیث ہے:

«أَقِيمُوا صُفُوفَكُمْ وَتَرَاصُّوا.»[2]

"صفیں سیدھی کرلو اور آپس میں بالکل مل جاؤ۔"

اس موضوع پر اس سے بھی زیادہ واضح فرمانِ نبوی ثابت ہے:

«حَاذُوا بَيْنَ الْمَنَاكِبِ، وَسُدُّوا الْخَلَلَ وَلَا تَذَرُوا فُرُجَاتِ الشَّيْطَانِ، وَمَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللهُ.»[3]

"اپنے کندھوں کو ایک دوسرے کے کندھے کے برابر کرلو۔ خلا (فاصلے) ختم کرلو اور شیطان کی درزیں نہ چھوڑو۔ اور جس نے صف ملائی اللہ اسے بھی ملائے گا۔"

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "ہم میں سے ایک اپنے کندھے کو دوسرے کے کندھے سے ملاتا تھا اور اپنے پاؤں کو دوسرے کے پاؤں کے ساتھ۔"[4]

نبی کریم ﷺ کی نمازوں کا انداز اَدورانیہ؟

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ....»[5]

"امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے..."

---

۱ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابٌ إِقَامَةُ الصَّفِّ مِنْ تَمَامِ الصَّلَاةِ:۷۲۳

۲ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ إِقْبَالِ الإِمَامِ عَلَى النَّاسِ، عِنْدَ تَسْوِيَةِ الصُّفُوفِ :۷۱۹

۳ السلسلة الصحيحة، حديث:۷۴۳

۴ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ إِلْزَاقِ المَنْكِبِ بِالمَنْكِبِ وَالقَدَمِ بِالقَدَمِ فِي الصَّفِّ :۷۲۵

۵ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابٌ إِقَامَةُ الصَّفِّ مِنْ تَمَامِ الصَّلَاةِ:۷۲۲

یہ حدیث مبارکہ امام کی اہمیت بتانے کو کافی ہے۔ اور آپ ﷺ کی امامت کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

امام کی خصوصیات اور تقرر

سیرت اور سنت کے مطالعے سے ہمیں ائمہ کرام کی خصوصیات کا بھی اندازہ ہوتا ہے، ان میں سے کچھ خصوصیات یہ ہیں:

① **قرآن مجید زیادہ سے زیادہ یاد ہو:** نماز میں تلاوت ہی وہ ظاہری خوبی ہے جو مقتدی حضرات سے امام کو ممتاز کرتی ہے۔ باقی رہا امام کا ورع، تقویٰ، خلوص اور تعلق باللہ یہ سب معنوی خوبیاں ہیں۔ آپ ﷺ نے اسی لیے سب سے پہلے اسی بات کا تذکرہ فرمایا کہ امامت وہ کرائے: «أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللهِ...»[1]

"جو ان سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والا ہو۔ اور اگر قراءت میں برابر ہوں تو سنت کو زیادہ جاننے والا امامت کرائے، اگر اس میں بھی برابر ہوں تو ہجرت میں پہل کرنے والا اور اگر اس میں بھی برابر ہوں تو امامت وہ کرائے جو ان میں سے عمر میں بڑا ہے۔"

جو شخص قرآن مجید زیادہ پڑھنے والا ہوگا، اسے اسی قدر از بر بھی ہوگا اور وہ اس کی قراءت میں ماہر ہوگا۔ اور سب سے پہلا حق اسی کا ہے۔ فرمانِ نبوی «أَقْرَؤُهُمْ» "ان سب سے زیادہ پڑھنے والا" سے مراد قراءت ہی ہے، اور اس کے علوم اور تفسیر جاننا مراد نہیں کیونکہ آپ ﷺ نے اس حدیث میں قرآن مجید کے لیے «أَقْرَؤُهُمْ» اور شرعی علم کے لیے «أَعْلَمُهُمْ» کے دو علیحدہ علیحدہ لفظ استعمال کیے ہیں اور دونوں کے معانی میں فرق موجود ہے۔

اس حدیث میں مذکور آخری نکتہ سے یہ بات بھی سمجھ آتی ہے کہ امامت کے منصب میں قراءت کے ساتھ عمر میں بڑے ہونے کی بھی ایک معتبر اہمیت ہے۔ کیونکہ بڑی عمر کی وجہ سے ان کا احترام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حفظ قرآن و قراءت میں دو ائمہ کے نام سامنے آرہے ہیں تو انھیں ترجیح دی جائے جو عمر میں بڑے ہیں۔ لیکن اگر بڑے تو موجود ہیں مگر قرآن میں مہارت تو دور کی بات، اچھے طریقے سے پڑھنا بھی نہیں جانتے تو پھر چھوٹی عمر کے قرآن مجید کے حافظ یا قاری کو ترجیح دی جائے گی۔ جیسا کہ عہدِ نبوی میں عمرو بن

---

1 صحیح مسلم، كِتَابُ فَضَائِلِ الْقُرْآنِ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهِ، بَابُ فَضْلِ مَنْ يَقُومُ بِالْقُرْآنِ، وَيُعَلِّمُهُ، وَفَضْلِ مَنْ تَعَلَّمَ حِكْمَةً مِنْ فِقْهٍ، أَوْ غَيْرِهِ فَعَمِلَ بِهَا وَعَلَّمَهَا: ۶۷۳؛ صحیح ابن خزیمہ، حدیث: ۱۵۰۷۔ شیخ البانی ﷫ نے اس احادیث کو صحیح کہا ہے۔ (صحیح سنن ابو داود: ۳/۱۲۹)

سلمہ رضی اللہ عنہ چھوٹی سی عمر میں منصبِ امامت پر فائز تھے کیونکہ انھوں نے آنے والے مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم سے سورتیں یاد کر رکھی تھیں۔[1]

② قراءت سکون سے ٹھہر ٹھہر کر کرے: نبی ﷺ کی زوجہ محترمہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ کی قراءت لمبی لمبی ہوتی تھی۔ ایک ایک آیت کر کے پڑھتے تھے، پھر انھوں نے باقاعدہ تلاوت کر کے دکھائی۔ چنانچہ ائمہ کرام کے لیے یہ سنت ٹھہری کہ وہ ایک ایک سانس میں ۵،۵ آیات پڑھنے کی بجائے ایک ایک آیت کو علیحدہ علیحدہ پڑھیں۔

③ امام حوصلہ مند ہو: ایک امام کا واسطہ مختلف ذہن اور طرز و ادا کے لوگوں سے رہتا ہے۔ کسی کے لہجے میں ترشی، کسی کے انداز میں درشتی، کوئی اعلیٰ اقدار کا حامل، کسی کو بولنے کا سلیقہ نہیں اور کوئی مسئلے پوچھ کر امام کو نیچا دکھانے کا آرزو مند۔ ان مختلف قسم کے لوگوں کو ڈیل کرنا، کڑوی کسیلی باتیں سننا یہ ائمہ کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے انھیں چاہیے کہ اس کام کے لیے پہاڑوں جتنا حوصلہ پیدا کریں۔

ایک دیہاتی معلّم انسانیت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں درشت لہجے میں بات کروں گا، آپ ﷺ محسوس نہیں فرماتے۔ اسی طرح ایک دیہاتی شخص مسجد نبوی میں پیشاب کرنے لگ جاتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اسے روکنے کے لیے اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ بڑے حوصلے سے فرماتے ہیں:

«لَا تُزْرِمُوهُ، دَعُوهُ.» "اس کو پیشاب سے نہ روکو، کر لینے دو۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم اسے پیشاب کرنے دیتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ پیشاب کرنے والے دیہاتی کو پاس بلاتے ہیں اور نصیحت فرماتے ہیں:

«إِنَّ هٰذِهِ الْمَسَاجِدَ لَا تَصْلُحُ لِشَيْءٍ مِنْ هٰذَا الْبَوْلِ وَلَا الْقَذَرِ، إِنَّمَا هِيَ لِذِكْرِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَالصَّلَاةِ وَقِرَاءَةِ الْقُرْآنِ.»[2]

"بے شک یہ مساجد ہیں۔ ان میں پیشاب یا گندگی وغیرہ درست نہیں۔ یہ تو اللہ عزوجل کے ذکر، نماز

---

1 صحيح البخاري، كِتَابُ الْمَغَازِي، بَابٌ: ﴿إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا وَاللهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾: ۴۳۰۲

2 صحيح البخاري، كِتَابُ الْوُضُوءِ، بَابُ تَرْكِ النَّبِيِّ ﷺ وَالنَّاسِ الْأَعْرَابِيَّ حَتَّى فَرَغَ مِنْ بَوْلِهِ فِي الْمَسْجِدِ: ۲۱۹؛ صحيح مسلم، كِتَابُ الطَّهَارَةِ، بَابُ وُجُوبِ غُسْلِ الْبَوْلِ وَغَيْرِهِ مِنَ النَّجَاسَاتِ إِذَا حَصَلَتْ فِي الْمَسْجِدِ، وَأَنَّ الْأَرْضَ تَطْهُرُ بِالْمَاءِ، مِنْ غَيْرِ حَاجَةٍ إِلَى حَفْرِهَا: ۲۸۵ اور ترجمہ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق ہے۔

اور قرآن کی تلاوت کے لیے ہیں۔"

پھر آپ ﷺ کسی شخص سے پانی منگواتے ہیں۔ وہ ڈول میں پانی لاتا ہے۔ آپ ﷺ پیشاب والی جگہ پر پانی بہا دیتے ہیں۔ ہمارے اس ماحول میں جہاں مقتدی حضرات خوبیوں سے محروم ہیں، وہاں ائمہ بھی بہت سی خوبیوں سے تہی دست ہیں۔ اگر کسی مقتدی سے غلطی سے بھی کچھ سرزد ہو جائے، مثلاً: وہ موبائل کو 'خاموش' کرنا بھول گیا ہے اور وہ نماز میں بجنے لگ گیا ہے تو ائمہ کو تمام نمازیوں کے سامنے اس کی تذلیل کا جواز مل جاتا ہے۔ اور زجر و توبیخ حسب طبیعت یا حسبِ مخاطب کم زیادہ ہو سکتی ہے۔ اگر چہ سارے ائمہ ایسے نہیں ہوتے۔

④ **امام جلد باز نہ ہو:** اگر امام جلد بازی کرے، کسی کو فوراً جواب دے یا فوری ردِ عمل کا اظہار کرے تو اس سے اس کی اپنی ساکھ متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ جلد بازی کے اکثر فیصلے یا اقدامات درست نہیں ہوتے۔ نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی اور دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا۔ ایک صحابی جن کا لقب ذو الیدین تھا، انھوں نے آپ ﷺ سے عرض کی: «أَنَسِيتَ أَمْ قُصِرَتِ الصَّلَاةُ؟»

یا تو آپ بھول گئے ہیں یا پھر نماز میں کمی ہو گئی ہے؟

آپ ﷺ نے اسے کچھ کہنے کی بجائے یہ اظہار فرمایا: «لَمْ أَنْسَ وَلَمْ تُقْصَرْ»

"نہ تو میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی ہوئی ہے۔"

پھر آپ ﷺ نے عمومی رائے لیتے ہوئے پوچھا: «أَكَمَا قَالَ ذُو الْيَدَيْنِ؟»

"کیا بات اسی طرح ہے جس طرح ذُو الیدین کہہ رہے ہیں؟"

صحابہ نے جواب دیا: جی ہاں! تو پھر آپ ﷺ آگے ہوئے اور جو حصہ رہ گیا تھا وہ پڑھایا، پھر سلام پھیرا۔ پھر دو سجدۂ سہو کیے اور سلام پھیر دیا۔"[1]

قارئین! نبی ﷺ کو یہ یقین تھا کہ میں نے پوری نماز پڑھائی ہے، اسی لیے تو آپ نے فرمایا: "نہ تو میں بھولا ہوں، نہ نماز میں کمی ہوئی ہے۔" اس کے باوجود ذو الیدین کی یاد دہانی کے بعد اس پر کوئی حکم نہیں لگایا، بلکہ مذکورہ بات ہی کہی۔ اور پھر دیگر صحابہ سے تصدیق کرائی اور ان کی تصدیق کے بعد نماز پڑھائی۔ اس واقعے میں جلد بازی کا یا بغیر سوچے سمجھے کسی اقدام، حکم یا زجر و توبیخ کا شائبہ تک نظر نہیں آیا۔ یہی خوبی کسی امام کے وقار کی ایک بڑی وجہ بن سکتی ہے۔

---

1 صحیح البخاري، ؟

⑤ **امام کا طرزِ تکلم اچھا ہو:** مقتدی حضرات کو کوئی بات سمجھانے کے لیے بہتر سے بہتر طرز تکلم اور عمدہ اُسلوب اختیار کیا جائے۔ بعض اوقات انسان ضد کی وجہ سے اپنے فائدے کی بات بھی ٹھکرا دیتا ہے۔ سیدنا ابو بکرہؓ نماز کے لیے آئے۔ اس وقت آپ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے اور رکوع کی حالت میں تھے۔ ابو بکرہؓ نے صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی رکوع کر دیا، پھر (حالت نماز ہی میں) چل کر صف میں شامل ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے نماز مکمل کی تو فرمانے لگے:

«أَيُّكُمُ الَّذِي رَكَعَ دُونَ الصَّفِّ ثُمَّ مَشَى إِلَى الصَّفِّ.»

"آپ لوگوں میں سے کس نے صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی رکوع کر لیا تھا اور پھر بعد میں صف میں آملا تھا؟"

ابو بکرہؓ کہنے لگے: میں نے۔ تو فرمایا: «زَادَكَ اللهُ حِرْصًا وَلَا تَعُدْ.»[1]

"اللہ نیکی پر تمہاری حرص میں اضافہ فرمائے، آئندہ ایسا نہ کرنا۔"

غلطی ہو بھی جائے تو اس کی اصلاح کے لیے اچھا طرزِ تکلم اپنایا جائے۔

⑥ **امام حساس اور ہمدردی کے جذبات سے متصف ہو:** امام کو دیگر اوصاف کے ساتھ ساتھ حساس اور ہمدردی سے متصف ہونا چاہیے۔ وہ امام ہی کیا جو اپنے مقتدیوں کے جذبات و احساسات ہی سے نا آشنا ہو۔ دیکھیے رسولِ اکرم ﷺ سے زیادہ قراءت میں تاثیر اور خوش الحانی کسے ودیعت ہو سکتی تھی، اس کے باوجود آپ ﷺ نمازیوں کا خیال رکھا کرتے تھے۔

سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے اپنی قوم کا امام مقرر فرما دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَنْتَ إِمَامُهُمْ» "تم ان کے امام ہو۔" اور ساتھ ہی مقتدیوں کا خیال رکھنے کی تلقین فرما دی: «وَاقْتَدِ بِأَضْعَفِهِمْ»[2] "اور ان میں سے سب سے کمزور کی اقتدا کرنا (خیال رکھنا)۔"

گویا ایک طرف امام مقتدیوں کی امامت کرا رہا ہے، دوسری طرف وہ مقتدیوں میں سے کمزور ترین مقتدی کا احساس دل میں لیے ہوئے اس کی اقتدا کر رہا ہے۔ یہ ہیں تعلیماتِ نبویہ!

نبی کریم ﷺ کے عہد میں ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک شخص اپنی پانی بھرنے والی اونٹنیاں لے کر اُس مسجد

---

1 سنن أبي داود، كِتَابُ تَفْرِيعِ أَبْوَابِ الصُّفُوفِ، بَابُ الرَّجُلِ يَرْكَعُ دُونَ الصَّفِّ: ٦٨٣

2 سنن أبي داود، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ أَخْذِ الْأَجْرِ عَلَى التَّأْذِينِ: ٥٣١

کے ہاں پہنچا جہاں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ وہ جب پہنچا تو سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے لگے تھے۔ وہ آگے بڑھا (اس کی اقتدا میں نماز تو شروع کی) تو سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ یا نساء کی قراءت شروع کر دی۔ اس شخص نے جماعت سے علیحدہ ہو کر اپنی نماز پڑھی اور چلا آیا۔ اسے خدشہ تھا کہ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اس سے ناراض ہوں گے کیونکہ اسے اس کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کرنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يا مُعَاذُ أَفَتَّانٌ أَنْتَ - أَوْ فَاتِنٌ ثَلَاثَ مِرَارٍ - فَلَوْلَا صَلَّيْتَ بِـ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى، وَ الشَّمْسِ وَ ضُحَاهَا، وَ اللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى. فَإِنَّهُ يُصَلِّي وَرَاءَكَ الْكَبِيرُ، وَالضَّعِيفُ وَذُو الْحَاجَةِ.»

"اے معاذ! کیا تم فتنہ پرور بننا چاہتے ہو، یا آپ نے فرمایا: فتنہ ڈالنے والے بننا چاہتے ہو۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا۔ پھر فرمانے لگے: تم نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى، وَ الشَّمْسِ وَضُحَاهَا، وَ اللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى (کی تلاوت کرکے) نماز کیوں نہ پڑھا دی؟ کیونکہ تمہارے پیچھے عمر رسیدہ، کمزور اور ضرورت مند لوگ بھی نماز پڑھتے ہیں۔"

یاد رہے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بہترین قاری تھے اور زبان نبوت سے یہ تلقین تھی کہ ان سے قرآن مجید کی قراءت سیکھی جائے۔[2]

واضح ہوا کہ مقتدیوں کا خیال رکھنا امام کی ذمہ داری ہے، لیکن یہ احتیاط فرض نمازوں میں ہے۔ نفل نماز میں، یعنی رمضان کے قیام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طویل قراءت بھی فرمائی۔ حتی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو سحری نکل جانے کا خدشہ لاحق ہو گیا۔[3]

اسی طرح اپنی تہجد کی نماز میں بھی سورۂ بقرہ، آلِ عمران اور نساء بھی ایک رکعت میں پڑھ جایا کرتے تھے۔ یہ بات اُمت کو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بتائی، وہ کہتے ہیں: "میں نے ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ بقرہ شروع کر دی۔ میں نے دل میں کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ بقرہ کی ۱۰۰ آیات پڑھیں گے اور رکوع کریں گے مگر آپ پڑھتے ہی گئے۔ میں نے پھر دل میں کہا: (شاید) سورۂ بقرہ پڑھ کر رکوع کریں گے، مگر

---

۱ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ مَنْ شَكَا إِمَامَهُ إِذَا طَوَّلَ. ۷۰۵؛ صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۶۹، ۱۰۶۸

۲ صحيح البخاري، كِتَابُ مَنَاقِبِ الأَنْصَارِ، بَابُ مَنَاقِبِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ: ۳۸۰۶

۳ سنن أبي داؤد، ابواب قيام الليل، بَابٌ فِي قِيَامِ شَهْرِ رَمَضَانَ: ۱۳۷۵

آپ نے قراءت جاری رکھی، پھر آپ ﷺ نے سورۂ نساء کی تلاوت فرمائی پھر سورۂ آل عمران کی تلاوت کی۔ آپ ٹھہر ٹھہر کر پڑھ رہے تھے، جب کسی تسبیح والی آیت کی تلاوت فرماتے تو تسبیح پڑھتے، جب کسی سوال کا ذکر آتا تو اللہ سے سوال کرتے، اور پناہ مانگنے کا ذکر آتا تو پناہ مانگتے پھر آپ ﷺ نے رکوع کیا اور اس میں سبحٰن ربي العظیم پڑھا۔ آپ کا رکوع بھی کم و بیش قیام جتنا تھا، پھر رکوع سے اُٹھے تو خاصی دیر کھڑے رہے اور یہ قومہ بھی تقریباً رکوع کے برابر تھا، پھر سجدہ کیا اور اس میں سبحٰن ربي الأعلیٰ پڑھا اور سجدہ بھی کم و بیش قیام جتنا ہی تھا۔"[1]

لیکن نبی ﷺ فرض نماز میں دوسرے ائمہ کو مختصر نماز پڑھانے کی تلقین کرتے تھے اور خود بھی مختصر نماز ہی پڑھاتے تھے جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "نبی ﷺ ہلکی مگر پوری نماز پڑھایا کرتے تھے۔"[2]

نبی کریم ﷺ سے زیادہ پُر اثر اور خوبصورت قراءت کس کی ہو سکتی تھی؟ اس کے باوجود آپ ﷺ نے نمازیوں کا خیال رکھا تو ائمہ کو بھی ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور ہمدردی کے ان جذبات کو شب و روز کے تمام مسائل میں پھیلا دینا چاہیے۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: «إِنَّكُمْ بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ.»[3]

"تمھیں آسانیاں کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔"[4]

⑦ امام یا خطیب داروغہ بننے کی کوشش نہ کریں: اپنی منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ائمہ کرام یا خطبائے عظام داروغے نہ بنیں کہ زبردستی کسی سے نیکی کا کام کروائیں۔ جمعہ پڑھانے کے بعد جب بھی نمازِ جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ اعلیٰ کا یہ حصہ ﴿ فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ۝ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَخْشَىٰ ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۝ ﴾ "نصیحت کریں اگر نصیحت فائدہ دے۔ وہ ضرور نصیحت حاصل کرے گا جس میں ڈر ہو گا اور بدبخت اس سے کنارہ کش رہے گا۔" پڑھیں اور دوسری رکعت میں سورۂ غاشیہ کی آیت ﴿ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ ﴾ "آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔" پر پہنچیں تو یہ آیات حوصلے اور ہمت میں اضافے کا باعث بنیں۔ کہ زبردستی کسی سے کام نہیں کرانا، بس دعوت دینی ہے۔ نبی ﷺ کی طرف سے جمعے کی نماز میں ان سورتوں کے انتخاب کی ایک حکمت یہ بھی

---

۱ صحیح مسلم، کِتَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِينَ وَقَصْرِهَا، بَابُ اسْتِحْبَابِ تَطْوِيلِ الْقِرَاءَةِ فِي صَلَاةِ اللَّيْلِ: ۷۷۲

۲ صحیح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ الإِيجَازِ فِي الصَّلاَةِ وَإِكْمَالِهَا: ۷۰۶

۳ صحیح البخاري: ۶۱۲۸؛ سنن ابی داؤد: ۳۸۰

۴ امام کو باجماعت نماز میں گرد و پیش کے حالات سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ بھی نماز پڑھانے کا ارادہ کرتے لیکن بچوں کے رونے کی آواز سن کر اپنی نماز کو مختصر کر دیا کرتے۔ (يَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ... صحیح بخاری: ۷۰۷)

ہو سکتی ہے کہ ہفتے بعد ائمہ کو یہ بات یاد کرادی جائے کہ تم ان پر داروغے نہیں ہو۔

⑧ **بروقت نماز کا اہتمام امام کی ذمہ داری ہے:** عہد نبوی میں اور اس کے بعد بھی بہت لمبے عرصے تک لوگ سورج اور اس کے سایوں سے نمازوں کے اوقات کا پتہ چلاتے تھے یا مؤذن کی اذان سن کر مسجد کی طرف آتے تھے۔ اس دور میں وقت اوپر نیچے ہو جانا بعید نہیں تھا۔ اب چونکہ باہمی مشاورت سے وقت طے ہو جاتا ہے، نیز دور بھی بڑی تیزی کا ہے۔ ہر شخص بہت سی مصروفیات میں گھرا ہوا ہے اور منٹ منٹ کا شیڈول رکھتا ہے، اس لیے ائمہ کرام کو طے شدہ اوقات میں بروقت نماز کرانی چاہیے۔ اسے کوئی پابندی یا دباؤ نہ سمجھا جائے، بلکہ یہ دیکھا جائے کہ اگر گھڑیاں نہ ہونے کے باوجود ہمارے سلف صالحین نماز کا بروقت اہتمام کرتے تھے تو گھڑیوں کی موجودگی میں ہم تاخیر کیوں کریں۔

رسول اکرم ﷺ کے بارے میں اُم المومنین عائشہ صدیقہ ؓ کہتی ہیں کہ

"آپ نے وفات تک دو نمازیں بھی آخری وقت میں نہیں پڑھائیں۔"[1]

وقت کی پابندی کی یہ ایک بہت بڑی مثال ہے، حالانکہ آپ ﷺ پر ایک ہی وقت میں کئی مصروفیات اور اہم ترین ذمہ داریاں تھیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جن ائمہ کرام کی ۲۴ گھنٹے میں ذمہ داری محض یہی ہے کہ وہ پانچ نمازیں پڑھادیں تو وہ لیٹ ہو جاتے ہیں۔ پھر مقتدی حضرات خصوصاً انتظامیہ کو غصہ کیوں نہ آئے۔

⑨ **نماز کے بعد نمازیوں سے بات چیت اور مصلائے امامت پر جاگزیں ہونا:** ائمہ اور مقتدی حضرات کے درمیان فاصلوں کی وجہ ایک دوسرے کو وقت نہ دینا بھی ہے۔ بہت سے مقتدی تو اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے کہ ہمیں علماء وائمہ کی صحبت میں چند لمحے گزارنے چاہئیں۔ اگر کوئی اس کا آرزو مند ہو بھی تو اسے ائمہ کی صحبت میسر نہیں آتی۔ سلام پھیرا اور چند ہی لمحوں بعد امام صاحب مصلیٰ چھوڑ کر چلے گئے۔ ائمہ کرام کی اپنی ضروریات اور مصروفیات ہوں گی۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی بہت سی دیگر مصروفیات تھیں اس کے باوجود آپ ﷺ خصوصاً نمازِ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک مصلائے امامت پر تشریف فرما رہتے اور اس دوران صحابہ کرام ؓ سے محوِ گفتگو بھی ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلنے کے بڑے بڑے دعویدار امام اس اُسوۂ نبوی کو اپنانے کے لیے تیار نہیں۔

سیدنا جابر بن سمرہ ؓ نبی ﷺ کے ان لمحات کو ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ ایک دن سیدنا سماک بن

---

1 جامع الترمذي، أبوَابُ الصَّلا

حرب رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: کیا آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے؟ وہ کہنے لگے: بہت زیادہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو فجر کی نماز سے لے کر طلوعِ آفتاب تک مصلائے امامت پر تشریف فرما رہتے تھے۔ اس دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفت و شنید کرتے اور جاہلیت کی باتیں بھی کرتے، پھر وہ ہنستے بھی۔ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے ہوتے۔[1] واضح ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صرف خطاب کے لیے تشریف فرما نہیں ہوتے تھے، اس کے علاوہ بھی ان میں گھل مل کر بیٹھتے تھے۔

⑩ **امام مقتدی حضرات سے کچھ پوچھ اور بتا سکتا ہے:** امام اور مقتدی کا پاکیزہ رشتہ ہمدردی اور خلوص کے جذبات سے پروان چڑھتا ہے۔ ہمدردی اور احساس کا اظہار ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت سے ممکن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کا خیال رکھا کرتے تھے۔

ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر رُخِ انور پھیرا تو ایک آدمی سب سے ہٹ کر علیحدہ بیٹھا ہوا تھا، جس نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مَنَعَكَ يَا فُلَانُ أَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ؟»

"اے فلاں! لوگوں کے ساتھ نماز نہ پڑھنے میں کیا وجہ حائل ہو گئی؟"

اس نے عرض کی: میں حالتِ جنابت میں تھا اور پانی تھا نہیں۔ فرمایا:

«عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ.»[2]

"تم سطحِ زمین (سے) کچھ (پاک مٹی) لے لیتے۔ وہ (تیمم کی صورت میں) تمھیں کافی ہو جاتی۔"

سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جنگِ خندق میں شدید زخمی ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ہی میں ان کا خیمہ لگوا دیا تاکہ ان کی دیکھ بھال کی جا سکے۔[3]

ایک دفعہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین مرتبہ جلدی جلدی نماز پڑھی اور ہر بار آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا رہا اور آپ یہی فرماتے رہے کہ «اِرْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ...»[4]

---

۱ صحيح مسلم، كِتَابُ الْفَضَائِلِ، بَاب تَبَسُّمِهِ ﷺ وَحُسْنِ عِشْرَتِهِ: ۲۳۲۲

۲ صحيح البخاري، كِتَابُ التَّيَمُّمِ، بَابُ الصَّعِيدِ الطَّيِّبِ وَضُوءُ الْمُسْلِمِ، يَكْفِيهِ مِنَ الْمَاءِ: ۳۴۴

۳ صحيح البخاري، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ الْخَيْمَةِ فِي الْمَسْجِدِ لِلْمَرْضَى وَغَيْرِهِمْ: ۴۶۳

۴ صحيح البخاري، كِتَابُ الْأَذَانِ، بَابُ وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِ فِي الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا، فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ، وَمَا يُجْهَرُ فِيهَا وَمَا يُخَافَتُ: ۷۵۷

"واپس چلے جاؤ، پھر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔"

پھر اس کے اندر نماز سیکھنے کے عندیہ پیدا ہوا اور آپ ﷺ نے اسے مکمل نماز پڑھنے کا طریقہ خود سکھایا۔

ائمہ کرام کے چند مزید ضروری اوصاف

- امام نرم مزاج ہونا چاہیے، اگر ایسا نہیں ہے تو نرمی کی کوشش کرنی چاہیے۔
- امام کو بلا تفریق تمام لوگوں سے خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہیے۔ اگرچہ کسی کا موقف امام سے متصادم ہی کیوں نہ ہو۔
- ہر ایک کے مسائل کو دل جمعی سے سننا اور ان کا حل بتانا چاہیے۔
- شرعی مسائل بتانے میں پوری احتیاط سے کام لینا چاہیے۔
- جو مسئلہ نہیں آرہا، اس بارے میں لاعلمی کا واضح اقرار کرنا چاہیے یا تحقیق کرنے کا وقت لے لینا چاہیے۔
- مقتدی حضرات اور متعلقین سے جو وعدہ کیا ہو، اسے حتی المقدور پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔
- غیبت تو عام لوگوں کو بھی نہیں کرنی چاہیے مگر علما کو از حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

ائمہ کرام کی رہائش؟

رسول اکرم ﷺ نے اپنی رہائش مسجد نبوی سے متصل حجروں میں رکھی تھی، لہٰذا ائمہ کرام کو بھی مسجد سے متصل رہائش ملنی چاہیے تاکہ دینی راہ نمائی میں عوام کے لیے مشکلات نہ ہوں۔ اور تمام اُمور اچھے انداز سے بروقت انجام دیے جاسکیں۔

مسجد کی اوپر والی منزل میں رہائش بنانے کے بارے میں اگرچہ اختلاف ہے مگر جواز کا پہلو راجح ہے۔ کیونکہ جب ایک جگہ کی حد بندی دیوار یا چھت سے کر دی جائے تو دوسری جگہ کا حکم وہ نہیں رہتا۔ مثلاً: دیوار کی ایک جانب واش روم اور دوسری جانب مسجد ہو تو دونوں کا حکم علیحدہ علیحدہ ہوگا۔ اسی طرح چھت پر خواتین کے وضو اور طہارت کی جگہ بنادی جائے تو اس سے مسجد کا تقدس پامال نہیں ہوگا، اسی طرح امام کی رہائش کا مسئلہ ہے۔ واللہ اعلم

امام اور خطیب کا تقرر حکمران یا نگران کی طرف سے ہو!

سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور منصب امامت کا سوال کرنے لگے۔

آپ ﷺ نے ان کا تقرر فرمادیا۔[1] اس سے مزید دو پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عہدے کی چاہت سے آپ نے منع فرمایا مگر 'امامت' کے عہدے کا سوال کرنے والے کو خود فائز فرمادیا۔ اس سے واضح ہوا کہ عہدے کی چاہت اور امامت یا خطابت کی ذمہ داری دونوں کا حکم علیحدہ علیحدہ[2] ہے۔

دوسرے یہ کہ حکمران یا نگران کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ وہ مختلف علاقوں کے حساب سے امام وخطیب کا تقرر کرے۔ یہ استدلال سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے مطالبۂ تعیناتی کی بنا پر ہے۔ اگر عہدِ نبوی کا ضابطہ انھیں بذاتِ خود امامت کے منصب پر فائز ہونے کی اجازت دیتا تو انھیں آپ ﷺ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سعودی عرب میں ائمہ کا تقرر حکومت کی ذمہ داری ہے جو باقاعدہ قابلیت والے ائمہ وخطبا مقرر کرتی ہے، لہٰذا وہاں افراتفری ہے، نہ فتنہ وفساد اور وہاں ائمہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس فرق کا مشاہدہ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہاں عام ائمہ وخطبا اور فوج داو قاف کے ائمہ وخطبا میں بہت واضح فرق ہے۔ عام سطح پر یہاں مسجد کے منتظمین میں سے ایک بڑے 'منتظم' کے اختیار میں سب کچھ ہوتا ہے، خواہ وہ ۱۰، ۲۰ سال سے امامت کرانے والے امام کو بلاشرعی عذر کان سے پکڑ کر نکال دے۔ دراصل مقامی لوگوں نے مسجد کے تعاون کے سلسلے میں اپنی جان چھڑانے کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہوتا ہے جو اُن کے حصے کا بھی تعاون کرتا رہے اور مسجد کے سرخ وسفید کا مالک ہو! یا پھر کئی لوگ سیاسی چال بازیوں کے ذریعے مسجد کی حد تک اپنی چودھراہٹ کے شوق پورے کرتے ہیں۔

مسجد میں امام یا خطیب کے تقرر کی بات آئے تو ریہرسل کے طور پر نماز اور جمعے پڑھائے جاتے ہیں۔ اور چیک کرنے والے کئی دکاندار ہوتے ہیں اور کئی زمیندار، کئی بنک ملازمین اور کئی ریڑھی بان۔ دراصل امام یا خطیب کے تقرر کے لیے کسی صاحبِ علم سے اور کم از کم مسجد کے پکے نمازی سے مشاورت کرنی چاہیے۔

---

۱ سنن أبي داود، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ مَتَى يُؤْمَرُ الْغُلَامُ بِالصَّلَاةِ:۴۹۷

۲ دراصل جن عہدوں کے مطالبے کی شریعت ممانعت ہے، اُن سے بالاترین حکام کے مناصب مراد ہیں جیسے خلیفہ یا قاضی، ممبر شوریٰ، کسی علاقے کا عامل اور امیر عساکر وغیرہ۔ یہ ایسے عہدے ہیں جو اپنے اوپر خود نگران ہوتے ہیں، ان کا تقرر حاکم وقت کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ کسی سے رخصت ورعایت لینے کے پابند نہیں ہوتے۔ عمومی ماتحت عہدوں کے لئے تو ملازمت کے اشتہارات دیے جاتے اور ان میں متعلقہ اہلیت کے لوگ اپنی درخواستیں پیش کرتے ہیں اور یہی دنیا کا معمول ہے۔ (ح۔م)

سیاسی حربوں کے ذریعے امامت کا حصول

مسجد میں ایک امام صاحب دیر سے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ بہت کم ہی دیکھا گیا ہے کہ کسی امام یا خطیب کو سارے کے سارے نمازی دل و جان سے چاہتے ہوں، لہٰذا ان سے کھچے کھچے رہنے والے نمازی ایک لابی بناتے ہیں اور وہ موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ ادھر امام سے کوئی غلطی سرزد ہوئی نہیں اور ادھر سے یہ لابی سرگرم ہوئی نہیں۔ اور اسی دوران وہاں کے مدرس یا حتی کہ خادم مسجد یا کسی کے ملنے ملانے والے کا نام متبادل کے طور پر پیش کر دیا گیا اور امام کو فارغ کر دیا گیا۔

جو امام نیا آتا ہے۔ سارے لوگ اس پر بھی متفق نہیں ہوتے اور مساجد مستقل طور پر 'حالتِ جنگ' میں رہتی ہیں۔ ایسے ائمہ جو زبردستی امام بنیں، ان کے لیے وعید ہے۔ حدیث مبارکہ ہے۔

«ثَلَاثَةٌ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَلَاةٌ وَلَا تَصْعَدُ إِلَى السَّمَاءِ وَلَا تُجَاوِزُ عَنْ رُؤُوسِهِمْ رَجُلٌ أَمَّ قَوْمًا وَهُمْ لَهُ كَارِهُونَ .»

"تین لوگوں کی نماز نہ قبول ہوتی ہے اور نہ آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے سروں سے اوپر اٹھتی ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی قوم کی امامت کرائے مگر وہ اسے ناپسند کر رہے ہوں۔"

یہ حدیث جہاں ایسے ائمہ کے لیے وعید ہے۔ وہاں ان مقتدیوں کے لیے بھی وعید ہے جو بغیر کسی شرعی اور اخلاقی وجہ کے ائمہ سے کدورت رکھتے ہیں۔ جیسے زبردستی امام بننے کا جرم ہے، ویسے ہی بلاجواز ائمہ کے بارے میں ناروا ذہن قائم کر لینا بھی ایک جرم ہے۔ حدیث مذکور میں اس بات کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ امام کو بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ ان کے مقتدی ان سے خوش رہیں، جب تک کوشش اللہ کی ناراضی کا باعث نہ بنے۔ اسی صورت یہ رشتہ ایک مقدس رشتہ بن سکتا ہے۔

امام کی معزولی کا مسئلہ

جیسے امام کے تقرر کی کچھ ہدایات اور شرائط ہیں، اسی طرح اسے معزول کرنے کے بھی ضابطے ہیں۔ یہ نہیں کہ مسجد میں پارٹی بازی ہو رہی ہو اور سارا نزلہ بے چارے امام یا خطیب پر آگرے۔ اکثر دیکھا گیا ہے انتظامی دشواریوں اور خلفشاروں میں آخر کار امام یا خطیب ہی کو قربانی کا بکرا بننا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ خود بے چارہ

---

1 صحیح ابن خزیمۃ: ۱/ ۱۶۱؛ السلسلۃ الصحیحۃ: ۲/ ۱۳۹

جو قربانی دینے کا درس دیتا رہتا ہے۔

آپ پڑھ آئے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نماز لمبی پڑھانے پر سخت ڈانٹا اور یہاں تک فرمایا کہ کیا تم فتنہ کھڑا کرنا چاہتے ہو؟ دراصل یہ وعید سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کے لیے تو تھی ہی اور ان کے توسط سے بعد والے ائمہ کو بھی مگر اشارۃً اس کا رخ ایسے نمازیوں کی طرف بھی محسوس ہوتا ہے جو اسے 'فتنہ' بنالیں۔

فتنے جیسے خدشے کے باوجود آپ ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو معزول نہیں کیا بلکہ انھیں مختصر سورتیں پڑھنے کی تلقین کی۔

لمبی نماز کیسے فتنہ بن سکتی ہے؟

وہ یوں کہ لوگ جماعت میں شامل ہونے سے کترائیں۔ اس امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے جو لمبی قراءت کرے گا اور رفتہ رفتہ لوگ منتشر ہوں گے اور علیحدہ جماعت کرائیں گے یا پھر امام کو معطل کرنے کی سوچیں گے۔ ایسی صورتحال کو فتنے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور ایسی صورتحال سے دوچار کرنے والے کو زبانِ رسالت نے فتّان کہا ہے۔ مگر یہ ضروری بھی نہیں کہ امام کے خلاف مقتدیوں کی ہر شکایت درست ہی ہو۔ کبھی مقتدی اپنی ناراضی یا خلش دور کرنے یا حسد کی آگ بجھانے کے لیے ایسے اقدام والزام سے بھی کام لیتے ہیں جو قطعاً ان کے لیے روا نہیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ اہل کوفہ نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے متعلق شکایت کی اور یہاں تک کہنے لگے کہ یہ اچھے طریقے سے نماز بھی نہیں پڑھاتے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور ان سے پوچھا: ابو اسحٰق! ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تم نماز اچھے طریقے سے نہیں پڑھاتے؟ سعد رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے: اللہ کی قسم! میں تو انھیں رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھاتا ہوں۔ میں کچھ کمی بیشی نہیں کرتا۔ میں اُنھیں عشا کی نماز پڑھاتا ہوں اور پہلی دو رکعتوں کو آخری دو رکعتوں کی نسبت لمبا کرتا ہوں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ابو اسحٰق! تمہاری نسبت میرا یہی گمان تھا۔

بعد ازاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ کچھ آدمی بھیجے۔ اُنھوں نے کوفہ کی تمام مساجد کے نمازیوں سے ان کے بارے میں رائے لی تو سبھی نے ان کی تعریف کی۔ مگر اُسامہ بن قتادہ نامی ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اگر آپ ہم سے زور دے کر پوچھ ہی رہے ہیں تو پھر سنیں: یہ خود مہم پر نہیں جاتے، نہ تقسیم کرنے میں برابری کرتے ہیں اور نہ فیصلہ کرنے میں عدل کرتے ہیں۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے:

"میں ضرور اس کو تین بد دعائیں دیتا ہوں: اگر یہ بندہ جھوٹا ہے اور نمایاں ہونے اور شہرت کے لیے کھڑا ہوا ہے تو (۱) اے اللہ! اس کی عمر لمبی کر دے۔ (۲) اس کا فقر اور محتاجی بھی لمبی کر دے۔ (۳) اور اسے فتنوں سے دوچار کر۔"

اس کے بعد (اسے ان کی بد دعا لگ گئی) اس کے متعلق جب بھی اس سے پوچھا جاتا وہ یہی جواب دیتا کہ مجھے سعد رضی اللہ عنہ کی بد دعا لگ گئی ہے۔ حدیث کے راوی عبد الملک کہتے ہیں: میں نے خود دیکھا وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا اس کی جنویں بڑھاپے کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے آچکی تھیں اس کے باوجود بھی وہ راستوں میں آتی جاتی چھوٹی بچیوں سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتا تھا۔"[1]

اللہ تعالیٰ ایسی صورتِ حال سے سب کو محفوظ فرمائے۔ لیکن یہ بات تو واضح ہے کہ بعض اہل کوفہ نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے متعلق بے جا شکایات لگائی تھیں۔

یہاں ان ائمہ کی معزولی کا ذکر کیا گیا جن سے لوگ کسی نہ کسی وجہ سے نالاں ہوں۔ ایسی صورتِ حال میں نگران کو اختیار حاصل ہے کہ وہ صورت حال دیکھ کر حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے فیصلہ کر دے۔

☆ اور بعض دفعہ امام کی معزولی کی وجہ شرعی ہوتی ہے۔ امام یا پیش رو ہونے کے باوجود کوئی اخلاقی یا شرعی بے ضابطگی سامنے آجائے تو ایسے امام کے متعلق کیا کیا جائے؟

اس کا جواب حدیثِ مبارکہ سے ملتا ہے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ قوم کی امامت کراتے تھے تو (ایک دن) انھوں نے قبلے کی طرف تھوک دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھ رہے تھے۔ جب وہ نماز پڑھا کر فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیوں سے فرمایا: «لَا يُصَلِّ لَكُمْ» "یہ (آئندہ) تمھیں نماز نہ پڑھائے۔" پھر جب اس نے (اگلی) نماز پڑھانے کا ارادہ کیا تو نمازیوں نے انھیں منع کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے متعلق بتایا۔ امام صاحب نے (براہِ راست) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے جواب دیا کہ "ہاں میں نے ہی یہ کہا تھا۔"[2]

دراصل امام تو پیشوا ہوتا ہے اگر وہ ایسے شرعی آداب کی پاسداری نہیں کرے گا تو مقتدیوں کو شرعی آداب سے کون روشناس کرائے گا؟ لہٰذا اگر امام کو معزول کرنے کا شرعی جواز موجود ہو تو ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایسے

---

۱ صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ وُجُوبِ القِرَاءَةِ لِلإِمَامِ وَالمَأْمُومِ فِي الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا، فِي الحَضَرِ وَالسَّفَرِ، وَمَا يُجْهَرُ فِيهَا وَمَا يُخَافَتُ: ۷۵۵

۲ سنن أبي داود، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ فِي كَرَاهِيَةِ الْبُزَاقِ فِي الْمَسْجِدِ: ۴۸۱

امام یا خطیب کو فارغ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

مسجد جانے کے باوجود جماعت نکل جائے!

جو مقتدی حضرات اہتمام کر کے مسجد جاتے ہیں، ان کی اگر جماعت نکل جائے تو انہیں بڑا غصہ آتا ہے۔ اگر امام کی طرف سے نماز مختصر کرنے یا حال ہی میں وقت تبدیل کرنے کی وجہ سے رہی ہے تو پھر بے چارے امام کی خیر نہیں۔ حالانکہ حدیث میں واضح ہے کہ ایک شخص جب نماز کے لیے مسجد پہنچتا ہے اس کے باوجود وہ جماعت کو نہیں پا سکا تو اس کا اجر لکھ دیا گیا ہے۔[1] ایسے مقتدی کو امام کی دل آزاری کرنے کی بجائے ثواب کی اُمید کرتے ہوئے اپنی نماز ادا کرنی چاہیے۔

بچے مسجد کی رونق

مقتدی حضرات اور ائمہ کرام کے تعلقات میں کشیدگی کی ایک وجہ بچے بھی ہیں، خواہ وہ امام و خطیب صاحب کے ہوں یا مقتدی حضرات میں سے کسی کے۔ بچے تو سانجھے ہوتے ہیں۔ اور بچے بچے ہی ہوتے ہیں مگر مساجد میں ان کا وجود ایسے ہی ہے جیسے ایک خوبصورت پارک میں بڑے بڑے سایہ دار درختوں کے ساتھ رنگ برنگ پھولوں سے سجی کیاریاں۔ اور ان کا بولنا ایسے بھاتا ہے جیسے گھنے درختوں پر صبح و شام پرندوں کا چہچہانا۔ جب ان کی مائیں اُنھیں ٹوپی پہنا کر یا سکارف اوڑھا کر ان کا تعلق مسجد و مکتب سے جوڑنا چاہتی ہیں تو پھر ائمہ و مدرسین کو بھی اس کی لاج رکھنی چاہیے۔ اگر وہ ناظرۂ قرآن کے دوران ہنسنے، رونے یا بھاگنے لگ گئے ہیں تو اُنھوں نے کون سا جرم کر لیا ہے؟ ویسے بھی تو ہمارا طائر خیال اِدھر اُدھر اُڑتا ہی رہتا ہے، بچوں کی وجہ سے توجہ بھٹک گئی تو کیا ہوا؟ نبی کریم ﷺ نے ائمہ کرام کے لیے روشن اور اعلیٰ مثال رکھی ہے۔

سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کا یہ فرمان ہمارے سامنے رکھتے ہیں:

«إِنِّي لَأَقُومُ فِي الصَّلَاةِ أُرِيدُ أَنْ أُطَوِّلَ فِيهَا فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَأَتَجَوَّزُ فِي صَلَاتِي كَرَاهِيَةَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمِّهِ.»[2]

"بے شک میں نماز کا قیام کرتا ہوں اور ارادہ رکھتا ہوں کہ قراءت لمبی کروں، اتنے میں کسی بچے کے

---

1 سنن أبي داود، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابٌ فِيمَنْ خَرَجَ يُرِيدُ الصَّلَاةَ فَسُبِقَ بِهَا: ٥٦٤

2 صحيح البخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ مَنْ أَخَفَّ الصَّلاَةَ عِنْدَ بُكَاءِ الصَّبِيِّ: ٧٠٧

رونے کی آواز سن لیتا ہوں تو اپنی نماز (باجماعت) مختصر کر لیتا ہوں کہ کہیں بچے کے رونے کے باعث اس کی ماں کو مشکل میں ڈال دوں۔"

ذرا غور کیجیے! رحمت عالم ﷺ نے نماز ختم ہونے کے بعد یہ نہیں فرمایا کہ چھوٹے بچوں کو مسجد میں نہ لایا کریں۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ ایسی مائیں گھر ہی نماز پڑھ لیا کریں، حالانکہ عورت کا نماز کے لیے مسجد میں آنا ضروری بھی نہیں۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے قرآن پاک کی تلاوت مختصر کر دی اور اس بچے کو یا اس کی وساطت سے اس کے سرپرستوں کی عزت پر ذرا سا حرف بھی نہیں آنے دیا۔ تربیت کے سنہرے انداز اور الفاظ کے بہترین چناؤ کا اس کے سوا کچھ مقصد نہیں تھا کہ جو بھی عورت اپنے چھوٹے بچے کو ساتھ لانا چاہتی ہو وہ اسے رونے سے حتیٰ المقدور روکنے کی کوشش کرے۔

بچے کے رونے کی وجہ سے آپ ﷺ کی قراءت میں یقیناً خلل واقع ہوتا ہو گا مگر آپ ﷺ نے اس کا اظہار بھی نہیں فرمایا بلکہ دوسروں کی سہولت کی خاطر اپنے ایسے جذبات کو امت کے سامنے رکھ دیا۔ وارثانِ منبر و محراب کے ذمے ہے کہ وہ سیرت کے ان پہلوؤں کا عملی اظہار کریں۔

کتنی عمر کے بچے کو مسجد میں لے جایا جائے؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کتنی عمر کے بچے مسجد آ سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بالکل چھوٹے بچے جو ماں کے ساتھ ہی رہتے ہیں، ان کی مائیں اگر مسجد آئیں گی تو ظاہر ہے انھیں بھی آنا پڑے گا۔ اور حدیث مذکور میں ایسے ہی بچے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح پارہ پڑھنے کے لیے بھی عمر کی کوئی قید نہیں، چھوٹے سے چھوٹے بچے جیسے ۳، ۴ سال یا اس سے بڑے بھی جائیں مگر جہاں تک مسجد میں جماعت کے ساتھ یا جمعے میں شریک ہونے کا تعلق ہے تو بچوں کو اس وقت لے جانا چاہیے جب انھیں کچھ نہ کچھ شعور آ جائے۔ اور وہ خاموشی اختیار کر سکیں۔ بعض اوقات ایسے چھوٹے بچے نماز یا جمعے کی خرابی کا باعث بن جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس حوالے سے جو راہ نمائی فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ

لامُرُوا صِبْیَانَکُمْ بِالصَّلَاۃِ إِذَا بَلَغُوا سَبْعًا.»[1]

"اپنے بچوں کو نماز کا کہو جب وہ سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں۔"

آپ ﷺ نے سات سال سے پہلے نماز کی طرف راغب کرنے کی تلقین نہیں فرمائی۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں حکمت ہے۔ آخر ۴، ۵ یا ۶ سال کے بجائے ۷ سال کی حد بندی کی گئی ہے تو یہ ہمیں بتا رہی ہے کہ اتنی عمر کے بچے کو کچھ نہ کچھ شعور آجاتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَوْلا مَا فِي الْبُيُوتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالذُّرِّيَّةِ أَقَمْتُ صَلاَةَ الْعِشَاءِ وَأَمَرْتُ فِتْيَانِي يُحَرِّقُونَ مَا فِي الْبُيُوتِ بِالنَّارِ.»[1]

"اگر گھروں میں عورتیں یا بچے نہ ہوں تو میں عشاء کی جماعت کراؤں اور نہ آنے والوں کے متعلق نوجوانوں کو حکم دوں کہ وہ اُن کو گھروں سمیت جلا دیں۔"

غرضیکہ چھوٹے بچوں کو مسجد میں لانے کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا بلکہ گھروں میں رہنے کا اشارہ موجود ہے۔ دراصل ۷ سال سے کم عمر کے بچے عمومی طور پر مسجد میں کھیل کود حتی کہ پاکی پلیدی کا خیال بھی نہیں رکھتے اور نماز و جمعہ میں کل وقتی خرابی کا باعث بنتے ہیں۔ واللہ اعلم!

اور بعض اوقات بچوں کی وجہ سے بڑے لڑ بھی پڑتے ہیں۔

یہاں تک بات تھی مقتدی حضرات یا محلے کے بچوں کے ساتھ ائمہ کرام اور مدرسین کے سلوک کی۔ یہاں تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے کہ بعض افراد کی طرف سے امام یا خطیب کے بچوں کے ساتھ یا ان بچوں کی وجہ سے ائمہ یا خطبا سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔

کئی نمازی یا سامعین تو امام یا خطیب کے بچوں کو مسجد میں دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ اُنھیں ڈانٹتے ہیں، انھیں مرعوب رکھتے ہیں، ان سے حقارت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوتی ہے کہ محلے کے لوگ اپنے امام کو ملازم سمجھتے ہیں۔ ایسے نمازیوں کے لیے بھی آپ ﷺ نے روشن مثال ہمارے سامنے رکھی ہے۔ بخاری شریف کی حدیث ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے راوی بھی سیدنا ابو قتادہؓ ہی ہیں جو مذکورہ حدیث کے راوی تھے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتِ زَيْنَبَ بِنْتِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَلِأَبِي الْعَاصِ بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا، وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا.»[2]

---

1 مسند احمد بن حنبل: ۸۷۹۶

2 صحيح البخاري، كِتَابُ الصَّلاَةِ، بَابُ إِذَا حَمَلَ جَارِيَةً صَغِيرَةً عَلَى عُنُقِهِ فِي الصَّلاَةِ: ۵۱۶

"بے شک رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے اور اپنی نواسی اور ابو العاص بن ربیعہ (ربیع) کی بیٹی امامہ بنت زینب کو اٹھائے ہوئے ہوتے۔ پھر جب آپ سجدہ کرتے انھیں (نیچے) رکھ دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اٹھا لیتے۔"

صحیح مسلم میں یہ وضاحت بھی ہے کہ آپ ﷺ نماز کروا رہے ہوتے۔[1]

ہمارے ہاں نماز میں بچے اٹھانے کا تصور بھی نہیں مگر امام صاحب کے بچے یا پوتے، نواسے اگر والد یا دادا جان یا نانا جان کی قراءت سن کر یا ان سے اُنسیت کی بنا پر مسجد آ ہی گئے ہیں تو بعض افراد کی طرف سے یہ بہت بڑا اعتراض بن جاتا ہے۔ مذکورہ حدیث کی رو سے ایسے مقتدی حضرات کو رویے میں نرمی لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ نبی کریم ﷺ سے زیادہ خشوع و خضوع کا خیال رکھنے والے نہیں ہو سکتے۔[2]

اگر مقتدی درس یا وعظ نہ سنیں؟

راقم کے مشاہدے کے مطابق امام یا خطیب اس شخص کو اچھا نہیں سمجھتے جو ان کے وعظ یا درس نہیں سنتے۔ ان سے ایک چڑ اور خار رکھتے ہیں کہ یہ ہمیں اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ ہماری بات کیوں نہیں سنتے؟ حالانکہ نبی کریم ﷺ بھی خطبہ عید کے لیے لوگوں کو اختیار دے دیا کرتے تھے۔ سیدنا عبد اللہ بن سائب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے عید کی نماز پڑھائی اور فرمایا:

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَنْصَرِفَ فَلْيَنْصَرِفْ وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُقِيمَ لِلْخُطْبَةِ فَلْيُقِمْ.»[3]

"جو واپس جانا پسند کرتا ہے وہ چلا جائے اور جو خطبے کے لیے ٹھہرنا چاہتا ہے، وہ ٹھہرا رہے۔"

اس سہولت اور اجازت کے برعکس میں نے خود کئی ائمہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے خطبہ نہ سنا، اس کی عید نہیں ہے! کاش ائمہ و خطبا بھی قلب و نظر میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ بعض خطبا اس بات پر راضی نہیں ہوتے کہ زیادہ تر افراد تو ان کا درس سننے کے لیے تیار ہیں، بلکہ اُٹھ کر جانے والے دو تین افراد کی ٹینشن لے رہے ہوتے ہیں... آخر کیوں؟ کیا کسی کو زبردستی کچھ سنایا جا سکتا ہے؟ یہ تو لوگوں کی اپنی خوش بختی یا

---

۱ صحیح مسلم، كِتَابُ الْمَسَاجِدِ وَمَوَاضِعِ الصَّلَاةِ، بَابُ جَوَازِ حَمْلِ الصِّبْيَانِ فِي الصَّلَاةِ: ۵۴۳

۲ مزید تفصیل کے لئے: 'مساجد میں بچوں کی آمد اور ان کی صف بندی کے احکام' از ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، مجلہ الاضواء، شیخ زید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ دسمبر ۲۰۱۴ء اور ہفت روزہ الاعتصام لاہور، دسمبر ۲۰۱۹ء

۳ سنن النسائي، كِتَابُ صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ، بَابُ التَّخْيِيرِ بَيْنَ الْجُلُوسِ فِي الْخُطْبَةِ لِلْعِيدَيْنِ. ۱۵۷۱

بد بختی ہوتی ہے۔ ان کے حصول اور محرومی میں ائمہ کا کردار تو تذکیر اور ریا دہانی کی حد تک ہی ہو سکتا ہے۔

ایک دفعہ نبی کریم ﷺ مسجد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جلو میں تشریف فرما تھے۔ اس دوران تین افراد آئے۔ ان میں سے دو نبی ﷺ کے پاس آ گئے اور ایک (باہر ہی سے) چلا گیا۔ (اندر آنے والے وہ) دو افراد رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر ٹھہرے۔ پھر ان دونوں میں سے ایک نے مجلس میں خالی جگہ دیکھی اور جا کر بیٹھ گیا اور دوسرا مجلس کے آخر ہی میں بیٹھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ جب (وعظ) سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

«أَلاَ أُخْبِرُكُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلاَثَةِ أَمَّا أَحَدُهُمْ فَأَوَى إِلَى اللهِ، فَآوَاهُ اللهُ، وَأَمَّا الآخَرُ فَاسْتَحْيَا، فَاسْتَحْيَا اللهُ مِنْهُ، وَأَمَّا الآخَرُ فَأَعْرَضَ، فَأَعْرَضَ اللهُ عَنْهُ»[1]

"کیا میں ان تین لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں۔ ان میں سے ایک نے تو اللہ کی طرف جگہ بنائی تو اللہ نے بھی اسے اپنی طرف جگہ دی۔ اور دوسرے نے شرم محسوس کی اور (مجلس سے رخ نہ پھیرا) تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی حیا کی اور تیسرا شخص رخ موڑ گیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے رخ موڑ لیا۔"

اس حدیث میں ائمہ و خطبا کے لیے کس قدر واضح سبق ہے کہ اگر کچھ لوگ اپنی شومی قسمت کی بنا پر نبوی مجلس سے رخ موڑ لیتے ہیں تو ایسے لوگوں کے لیے آپ کے وعظ و درس کیا حیثیت رکھتے ہیں؟

امام سے بھی غلطی ممکن ہے!

نماز میں بھول جانے کے واقعے والی حدیث ہمیں واضح بتا رہی ہے کہ امام سے بھول چوک یا غلطی کا ہو جانا بعید نہیں۔ اس میں ائمہ کے لیے سبق ہے اور مقتدی حضرات کے لیے بھی۔ مقتدیوں کے لیے تو یہ ہے کہ وہ ائمہ کرام کو فرشتہ نہ سمجھیں بلکہ انسان ہی گردانیں اور یہ جان لیں جیسے اُن سے اپنے اپنے میدان میں بھول چوک ہو جاتی ہے اور غلطیاں لگ جاتی ہیں، اسی طرح ائمہ بھی اپنے فرض میں غلطی اور نسیان کا شکار ہو سکتے ہیں۔

اور ائمہ کے لیے سبق یہ ہے کہ وہ اسے عزتِ نفس کا مسئلہ نہ بنا لیں بلکہ اقرار کریں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے یا میں بھول گیا ہوں۔ اس سے ان کے وقار میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہو گا۔ نبی کریم ﷺ ایک دفعہ نماز پڑھا رہے تھے کہ نماز میں (کوئی معمولی سا) فرق آیا۔ آپ سے عرض کی گئی: اللہ کے رسول! نماز میں کوئی فرق آ گیا ہے؟ فرمایا: "بات کیا ہے؟" عرض کی: آپ نے ایسے اور طرح نماز پڑھائی ہے۔ اس دوران آپ دو زانو ہو کر

---

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ العِلْمِ، بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ المَجْلِسُ، وَمَنْ رَأَى فُرْجَةً فِي الحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا:٦٦

بیٹھے، قبلے کی طرف رخ کیا اور دو سجدے کیے پھر سلام پھیرا۔ پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے:

«إِنَّهُ لَوْ حدثت فِي الصلاةِ شَيْءٌ لَنَبَّأْتُكُمْ »

"حقیقت تو یہ ہے کہ اگر نماز میں کوئی نیا طریقہ آیا ہوتا تو میں تمھیں ضرور آگاہ کر دیتا۔"

«إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ أَنْسَى كَمَا تَنْسَوْنَ فَإِذَا نسيت فَذَكِّرُونِي »

"سوائے اس کے نہیں، میں تمہاری طرح بشر ہی ہوں۔ جس طرح تم بھول جایا کرتے ہو میں بھی بھول جاتا ہوں، تو جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دہانی کرا دیا کرو۔"

نبی ﷺ نے اُمت کے ائمہ کے لیے بہترین طرزِ عمل اختیار فرمایا ہے کہ اگر کسی سے نماز پڑھاتے ہوئے غلطی یا بھول چوک ہو جائے تو وہ کھلے دل سے اس کا اعتراف کرے کیونکہ آخر وہ بھی ایک انسان ہی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کے ادب و احترام کا خیال رکھتے تھے۔ اوپر ذکر کی گئی دونوں احادیث میں صحابہ نے سوالیہ انداز ہی میں دریافت کیا۔ لہٰذا اگر امام صاحب بھول جائیں تو مقتدیوں کو بھی عمدہ انداز اختیار کرنا چاہیے۔ مگر بعض اوقات مقتدیوں کی طرف سے بڑے تلخ جملے سننے کو ملتے ہیں۔ مثلاً: خیر تو ہے؟ آپ کہاں پہنچے ہوئے تھے؟ اور پھر اس میں پوچھنے والے کا انداز اور اپنی اپنی بولی کی چاشنی اور اشارے اضافی ہوتے ہیں۔ ایسا کرنے والوں کی اکثریت محض بزم آرائی کے لیے یا امام صاحب کا مقام کم کرنے کے لیے ایسا کرتی ہے کیونکہ نماز تو ہو چکی ہوتی ہے۔

شاید ایسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ائمہ کی وجہ سے ان کے ثواب میں کمی واقع ہو رہی ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے اسی ضمن میں راہ نمائی کرتے ہوئے بڑے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا:

«يُصَلُّونَ لَكُمْ فَإِنْ أَصَابُوا فَلَكُمْ وَلَهُمْ، وَإِنْ أَخْطَئُوا فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ.»[2]

"ائمہ تمہیں نماز پڑھاتے ہیں۔ تو اگر وہ صحیح پڑھائیں تو تمہارے لیے بھی اجر ہے اور ان کے لیے بھی اور اگر ان سے غلطی سرزد ہو تو تمہارا اجر تو تمہیں ملے گا مگر غلطی کی سزا ان پر ہو گی۔"

لہٰذا مقتدیوں کو خواہ مخواہ کڑھنے کی بجائے اس حدیث کی روشنی میں مطمئن ہو جانا چاہیے اور یہی اس حدیث کا مقصد ہے۔ اگرچہ اس حدیث کے بعض طرق میں ائمہ کی خطا سے مراد نماز کو مؤخر کرنا ہے، مگر اس

---

۱ صحيح البخاري، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ التَّوَجُّهِ نَحْوَ الْقِبْلَةِ حَيْثُ كَانَ: ۴۰۱

۲ صحيح البخاري، كِتَابُ الْأَذَانِ، بَابُ إِذَا لَمْ يُتِمَّ الْإِمَامُ وَأَتَمَّ مَنْ خَلْفَهُ: ۶۹۴

کے ساتھ ساتھ بعض طرق میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«فَإِنْ صَلُّوا الصَّلَاةَ لِوَقْتِهَا فَأَتَمُّوا الرُّكُوعَ وَالسُّجُودَ فَهِيَ لَكُمْ وَلَهُمْ...»[1]

"تو اگر وہ وقت پر نماز پڑھائیں اور رکوع و سجود پورے کریں تو تمہارے لیے بھی اجر ہے اور ان کے لیے بھی۔"

مقتدی حضرات کی حساسیت

مقتدی حضرات کو ائمہ سے یہ گلہ بھی رہتا ہے کہ ائمہ سب کے سامنے کوئی مسئلہ سمجھانا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ایسے امام کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتے جو کسی کو متعین کر کے کوئی مسئلہ سمجھائے۔ بالفرض اگر امام نے صفیں درست کراتے ہوئے کسی نمازی کو مخاطب کر کے کہہ دیا کہ آپ تھوڑا سا آگے یا پیچھے ہو جائیں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو اسی بات سے امام سے کھچے کھچے رہنے لگتے ہیں۔

یہ بات تو درست ہے کہ آپ ﷺ کوئی غلطی دیکھتے تو عمومی طور پر اس کا تذکرہ فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ لیکن کیا کسی ایک کو خاص کر کے آپ ﷺ نے ٹوکا نہیں؟ ایسا نہیں ہے۔ آپ ﷺ ایسی کوئی بات دیکھتے یا محسوس کرتے تو سرعام یہ سوال بھی فرمالیتے تھے کہ یہ کام کس نے کیا ہے؟ اور سرعام پوچھنے کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ سب کی اصلاح ہو جائے۔ جیسا کہ سیدنا ابو بکرہؓ نے صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی رکوع کر لیا تو آپ ﷺ نے نماز ختم ہوتے ہی تمام نمازیوں سے فرمایا:

«أَيُّكُمُ الَّذِي رَكَعَ دُونَ الصَّفِّ ثُمَّ مَشٰى إِلَى الصَّفِّ.»[2]

"تم میں سے کس نے صف میں ملنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا تھا پھر بعد میں چل کر صف میں شامل ہوا تھا؟ ابو بکرہؓ نے عرض کیا: میں نے۔"

اس حدیث میں کس قدر واضح ہے کہ کسی نے غلطی کی ہو تو اسے مخاطب کر کے سرعام سمجھایا جا سکتا ہے۔ مگر سمجھانے میں بہتر سے بہتر اُسلوب اختیار کرنا امام کی ذمے داری ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی غلطی کو غلطی کا روپ دینے کے بجائے نیکی کی چاہت اور حرص سے تعبیر کر کے ان کے حوصلے کو بڑھا دیا۔

---

1. مسند احمد بن حنبل: ۴/ ۱۴۶

2. سنن أبي داؤد، كِتَابُ تَفْرِيعِ أَبْوَابِ الصُّفُوفِ، بَابُ الرَّجُلِ يَرْكَعُ دُونَ الصَّفِّ: ۶۸۴؛ صحیح البخاري، كِتَابُ الْأَذَانِ، بَابُ إِذَا رَكَعَ دُونَ الصَّفِّ: ۷۸۳

مسجد انتظامیہ کی ضرورت

عہد نبوت میں امام اور مؤذن کے تقرر کے دلائل تو ملتے ہیں مگر علیحدہ سے کسی انتظامیہ کا وجود نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ نہ بلند و بالا فرنشڈ اور ائیر کنڈیشنڈ مساجد تھیں اور نہ لمبے چوڑے اخراجات اور نہ ہی بلوں کی ادائیگی کی ضرورت... جہاں تک مسجد کی صفائی کا تعلق تھا تو اس دور کے لوگوں کو اس کی جزا سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ بس ان کے لیے یہی کافی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

«عُرِضَتْ عَلَيَّ أُجُورُ أُمَّتِي حَتَّى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ»[1]

"مجھ پر میری امت کے اجر پیش کیے گئے حتی کہ وہ تنکا بھی جسے ایک شخص (صفائی کے لیے) مسجد سے نکالتا ہے۔"

ہاں! رضاکارانہ طور پر کسی نے صفائی کی ذمہ داری لے لی ہو تو یہ علیحدہ بات ہے جیسا کہ عہدِ نبوی میں ایک سیاہ فام مرد یا خاتون مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔[2]

اصل شرعی طریقہ تو یہ ہے کہ مساجد کا قیام اور اس کے اخراجات سمیت امام و مؤذن کا تقرر مسلمان حاکم کی ذمہ داری ہے، جیسا کہ پیچھے سعودی عرب میں مروجہ نظام مساجد کا ذکر ہوا۔ جب مسلمان حاکم اپنی ان ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے تو مسجد کے بہت سے انتظامات، ضروریات اور تقاضوں کے لیے انتظامیہ کی ضرورت ہے جس کا مقصد مسجد کی آبادکاری اور للّٰہیت ہونا چاہیے، نہ کہ وہ اس عظیم سعادت کو فخر و ریا اور شہرت و سیاست کی بھینٹ چڑھا دیں۔ اس وقت تک معاملات صحیح سمت چلتے رہتے ہیں، جب انتظامیہ اور ائمہ اپنے اپنے حقوق سے عہدہ برآ ہوتے رہیں۔ اور معاملات اس وقت بگڑ جاتے ہیں جب ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی کی جاتی ہے اور ایک دوسرے کی حیثیت کو قبول نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مساجد آباد کرنے کی توفیق دے اور ائمہ کرام اور خطبا حضرات کو سنت کی روشنی میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق بخشے اور مقتدی حضرات کو بھی ائمہ کا مقام پہچاننے کی صلاحیت سے نوازے۔ آمین!

---

۱ سنن أبي داود، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابٌ فِي كَنْسِ الْمَسْجِدِ: ۴۶۱

۲ صحيح البخاري، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ كَنْسِ الْمَسْجِدِ وَالِتِقَاطِ الخِرَقِ وَالقَذَى وَالعِيدَانِ: ۴۵۸

'اقوام متحدہ کے حق خودارادی' اور 'جہادِ اسلامی' کا تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

حکومت کا روایتی اور اسلامی نظریہ

ہمیشہ سے انسانی معاشروں کو طاقت وغلبہ اور حاکم ومحکوم کے ذریعے منظم کیا جاتا رہا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں ایک غالب طاقت کے احکام، دوسروں کو تسلیم کرنا پڑتے ہیں اور وہی محکوموں کے حقوق کا تعین کرتا ہے۔ ماضی میں غالب عسکری، مالی یا نظریاتی قوتیں کمزوروں پر غلبہ جما کر اُنہیں اپنے مفاد پر مبنی قوانین وضوابط کا پابند کر دیتیں اور ان کے جان ومال پر قابض ہو جایا کرتی تھیں۔

اسلام نے انسانوں میں فطری حاکمیت کو جاری تو رکھا کہ دباؤ کے بغیر انسان سدھار پر قائم نہیں رہتا، لیکن غلط وجوہات کی بنا پر حکومت کے ناجائز طریقوں جیسے جاگیرداری، بادشاہت اور پاپائی نظریات کی کھلی نفی کی۔ اسلام نے حاکمیت کے نظریے کو ایک جیسے اوصاف کے مالک انسانوں کے ظلم وتعدی سے نکال کر، مخلوق انسانی کے لئے رضامندی اور آزادی سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قبول کرنے کا عقیدہ پیش کیا۔ دعوت وتلقین کے ذریعے جو انسان اس کو مان لیتا ہے، وہ مطیع وتبع (نسلم) قرار پا کر، اپنی پوری انفرادی واجتماعی زندگی اللہ کی ہدایت کے تحت بسر کرنے کا عہد کرتا ہے۔ جو لوگ اس ہدایت کو نہیں مانتے، طاقت میسر آنے کے بعد اسلام مسلمانوں کو جہاد کفار کی ہدایت دیتا ہے کیونکہ کسی معاشرے میں بھی انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں پر جبر وتسلط کا کوئی حق نہیں اور یہی بات جنگ قادسیہ ۱۵ھ میں سیدنا ربعیؓ بن عامر نے وقت کی سپر پاور کسریٰ کے جرنیل رستم فرخزاد کو کہی تھی کہ 'اسلام کا مقصد اللہ کے بندوں کو، اس کے ظالم بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں دینا'[1] ہے۔

اللہ جل جلالہ کی اس عبادت وطاعت کو ہر معاشرے کے سماجی قانون Public Law میں جاری وساری کرنا جہاد کا مقصد ہے جبکہ انفرادی طور پر ہر انسان بلا جبر واکراہ جو بھی نظریہ اختیار کرے، اُسی پر اس کی ذاتی فلاح ونجات کا دار ومدار ہے۔ **اللہ کی حاکمیت کا علم:** اللہ کی کتاب، اس کے رسول ﷺ کی ہدایات اور اس کے بہترین پیروکار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتماعی معمولات سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو ہر دور میں اس کے

---

[1] الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد إلى عبادة الله، ومن ضيق الدنيا إلى سعتها ومن جور الأديان إلى عدل الإسلام فأرسلنا بدينه إلى خلقه لندعوهم إليه (البدایۃ والنہایۃ از حافظ ابن کثیر: جلد ہفتم، غزوہ قادسیہ)

نبی کریم ﷺ کا سیاسی جانشین خلیفہ، اللہ کے دین پر عمل پیرا اور علوم نبوت کے وارث علمائے ربانی (ارکان شوریٰ) کی مشاورت کے ساتھ مل کر نافذ و جاری کرتا ہے۔ نازل شدہ احکام کو براہِ راست اور تدبیری اُمور میں شوریٰ کی مشاورت کے ذریعے خلیفہ مسلمانوں اور ان کی امان میں آنے والے کفار پر اللہ کی ہدایات کو اس لئے جاری کرتا ہے تاکہ اُن کے دین و دنیا، ہر دو کی دائمی، ہمہ نوعیتی اور مکمل صلاح و فلاح ہو جائے۔

حکومت کا الحادی متجددانہ نظریہ

معلوم تاریخ سے دو، تین صدیاں پہلے تک، دنیا میں حاکم و محکوم کے اسی نظریے پر عمل ہوتا رہا اور نظریاتی بنیادوں پر ہی حکومت و ممالک تشکیل پاتے رہے۔ تا آنکہ باغی انسانوں نے ظالم حکام کے ساتھ ساتھ، اپنے خدائے واحد و برتر کی عبادت و طاعت سے بھی آزادی کا نعرہ لگایا، اور انسان کی حاکمیت کے نام پر، بیرونی غلبہ و تسلط کی بجائے انسانوں کی داخلی رذاتی پسند و ناپسند کو حکومت کی بنیاد قرار دیا۔ اب ظاہر ہے کہ تمام انسان تو حکومت نہیں کر سکتے، نتیجتاً ماضی کے جابر و طاقتور حاکم کا شاکی باغی انسان اکثریتی اور غالب عوام کی حکومت و تسلط کا نعرہ لگانے پر مجبور[2] ہو گیا۔ اور اس نے نظریاتی معاشروں کی بجائے، زمینی / وطنی حد بندیوں میں اپنے آپ کو بانٹ لینے کا نعرہ لگایا۔ اپنے خالق ربّ کریم کے باغی و منکر (کافر) انسان نے زندگی کے ہر میدان میں

---

۱ جب اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا اسی کی عبادت و طاعت پر کاربند ہونا ہی اسلام ہے، تو اللہ کی ہدایت میں انسانوں کا عمل دخل اتنا ہی ہے جس قدر مجبوری ہے۔ قرآن و سنت اور اجماع کے بعد حکام و سلما اسلام یعنی اللہ کی حاکمیت کو نافذ و رائج کرتے ہیں۔ اور حکام و علما کا وہی اقدام 'اللہ کا حکم' کہلا سکتا ہے جس میں وہ اللہ کی منشا و مراد تک درست طور پر پہنچے ہوں۔ جس کی صورت یہ ہے کہ حکام اپنے قوانین کی منفعت، مقاصد شرع سے ہم آہنگی اور کتاب و سنت سے عدم مخالفت کو، اور علما اپنے شرعی موقف کی دلیل کو کتاب و سنت سے بیان کریں۔ بصورتِ غلطی، حکام و علما کی رائے، اللہ تعالیٰ کی بجائے انہی کی طرف منسوب ہو گی، اور اس کی دل سے حقیقی اتباع کرنا ضروری نہیں، تاہم فوری مصلحت کی خاطر ظاہری حد تک اس پر عمل بجالایا جا سکتا ہے۔ یہی مقصد ہے امام ابن تیمیہ کے اس موقف کا: وَأُولُو الْأَمْرِ صِنْفَانِ: الْأُمَرَاءُ وَالْعُلَمَاءُ، وَهُمُ الَّذِينَ إِذَا صَلَحُوا صَلَحَ النَّاسُ، فَعَلَى كُلِّ مِنْهُمَا أَن يتحرى بما يَقُولُهُ وَيَفْعَلُهُ طَاعَةَ اللهِ وَرَسُولِهِ، وَاتِّبَاعَ كِتَابِ اللهِ. (السیاسۃ الشرعیۃ: ۱۲۷) کہ "مسلم معاشرے کے دو حاکم: علما اور اسرا ہیں، (پہلے نظریاتی و شرعی حاکم اور دوسرے واقعاتی و تدبیری حاکم)، اور معاشروں کی فلاح و صلاح کا دارومدار ان دونوں پر موقوف ہے۔ اور دونوں کا فریضہ قرآن و سنت میں غور و فکر کر کے اللہ کی منشا کی جستجو کرنا ہے۔" اسی کو ایسی الٰہی حکومت (حکم شرعی) کہتے ہیں جس کا فرد و معاشرہ کے مختلف میدانوں میں (اصولِ فقہ کی زبانی) حاکم ہونے کے ناطے خالق عزوجل نے اپنی محکوم مسلمان مخلوق سے مطالبہ کیا ہے۔

۲ آزادی کی نام لیوا جمہوریت کے اسی جابرانہ نظریے کو علامہ اقبال نے اس شعر میں بیان کر دیا ہے: ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے، یہ آزادی کی ہے نیلم پری

خباثت وشیطنت کو پروان چڑھایا، جیسے کھانے میں خنزیر جیسی نجاست، پینے میں شراب جیسی بدبو دار چیز (جو شرف انسانیت عقل کی دشمن ہے)، سننے میں فسق وفجور پر مبنی میوزک، جھوٹ پر استوار مرد وزن کے صنفی رشتے، تعلقات میں بدکاری اور جسم فروشی، محرم رشتوں میں جنسی تعلقات، مرد وزن کے جوڑے کی بجائے ہم جنس پرستی، جانوروں سے بدکاری، فحاشی وعریانی اور بدنظری کو ایک تہذیب کا درجہ دینا، دنیا میں آنے سے قبل رحم مادر میں اسقاطِ حمل کے ذریعے کروڑوں انسانوں کو ہلاک کر دینا، ڈے کیئر کے ذریعے معصوم بچوں کو مامتا سے محروم اور اولڈ ہاؤسز کے ذریعے بوڑھوں کو اولاد واعزہ کے شفیق تعلق سے دور کرنے کا ظلم، اعتقاد میں اللہ کو چھوڑ کر خود ساختہ سیکڑوں دیوتاؤں، تثلیث کے تین خداؤں، اللہ کی فرضی اولاد کے یہودی وعیسائی مشرکانہ دعوؤں، محسن انسانیت ﷺ کو دہشت گرد اور ان کی مسلسل توہین کو انسانی حق سمجھنا، قرآنِ مجید کو صحیفہ رحمت کی بجائے انسانیت دشمن کتاب بتانا اور اُسے نذرِ آتش کرنا، انسانیت کو مہلک ترین ہتھیاروں کا تحفہ اور دنیا بھر میں موت کی سوداگری کرنا، عراق، افغانستان، کشمیر، برما، انڈیا، چیچنیا، بوسنیا، دو عالمی جنگوں، ہیروشیما، ماسکو اور بیجنگ میں کروڑوں[1] انسانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانا، معیشت میں سود و ٹیکس کے ذریعے غریب انسانوں کے وسائل کو صرف ایک فیصد سے کم انسانوں میں بانٹ دینا، اور قمار بازی کے ہر سو پھیلے اڈے Casinos وغیرہ۔

اللہ کی نعمت کا استحصال کرنے والے پر آسائش لوگوں کے چند سالہ دنیوی زندگی کے خود ساختہ حقوق کی محافظ اس تہذیبِ مغرب نے اپنے گوناگوں مظالم کے ساتھ یہ نعرہ بھی لگایا کہ "غلبہ وطاقت کی بجائے، اب معاشروں میں حکومت کا معیار انسانوں کے ذاتی فیصلے یعنی حق خود ارادی / استصوابِ رائے / ووٹنگ ہوگی۔"

---

[1] اگر مغربی تہذیب کے قیام میں کام آنے والے انسانوں کی ہلاکت کا جائزہ لیا جائے تو ساری معلوم انسانی مذہبی تاریخ کی جنگوں کے مقتولین سے اس کی تعداد بلاشبہ سیکڑوں گنا متجاوز ہے۔ جمہوریت واشتراکیت نے اپنے قیام کے وقت کتنے نفوس کے خون سے ہاتھ رنگے اور قیام کے بعد مقدس نظریات کے نام پر جس طرح انسانیت کے خون کی ہولی کھیلی، اس کا شماریاتی مطالعہ ہی رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ جنگ عظیم اوّل ودوم: تین کروڑ، انقلاب روس / ماسکو ۱۹۱۷ء میں لینن نے دو کروڑ، چین میں ماؤزے تنگ کے ۳ کروڑ بہیمانہ قتل، پھر ان کے وضع کردہ قوانین جس طرح کروڑوں انسانوں کو وجود میں آنے سے قبل عالم عدم سدھارتے ہیں۔

اس سے قبل الحادی استعمار نے جس طرح دنیا بھر کی نو آبادیوں میں سفاکانہ مظالم کا ارتکاب کیا۔ جمہوریت کے نقطہ آغاز فرانسیسی انقلاب ۱۷۸۹ء کا شعار گلے کاٹنے والی 'گلوٹین' مشین کا تذکرہ آج بھی تاریخی کتب میں بدترین بربریت کی داستان سناتا ہے۔ برصغیر میں انگریزی استعمار کسی جمہوری مکالمہ کے نتیجے میں نہیں، بلکہ بدترین تشدد اور قتل وغارت، مکاری وسفاکی اور سازش وفریب کے نتیجے میں قائم اور مستحکم ہوا۔ بنگال کے قحط، امرتسر کے جلیانوالہ باغ اور پشاور وگوجرانوالہ میں ہونے والی درندگی اس کے چند بچے کھچے اوراق ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت ۴۰ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کی قتل وغارت بھی برطانوی سازش کا حصہ تھی جب راتوں رات ریڈکلف لکیر کھینچ کر نہتے مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی۔ پھر کشمیر وفلسطین کے سلگتے مسائل بھی اسی مغرب کی 'انسان دوست تہذیب' کے تحفے ہیں جن کی تعریف میں مرعوبیت پسند ہر دم رطب اللسان رہتے ہیں۔

تہذیب حاضر کا بھیانک پہلو یہ ہے کہ مذکورہ بدترین مظاہر کی حامل قوتوں نے طاقت حاصل کر کے، اقوام متحدہ United Nations کے نام سے اپنے مفادات کا محافظ ایک ادارہ تشکیل دیا، جس نے مغربی طاقتوں کی پشت پناہی اور منصوبہ بندی سے دنیا میں پہلی بار دو صد ریاستوں پر ایک کفریہ اور جابرانہ عالمی نظام بھی تشکیل دے لیا۔ عالمی جنگوں کے بعد طاقتور حکومتوں نے مسلسل معاہدوں اور ادارتی صف بندی کے ذریعے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر اپنی طاقتوں کو یوں منظم کیا کہ دیگر ریاستوں کو ان کے وضع کردہ اُصولوں پر قیام، بقا، اور عالمی روابط کی اجازت ملی۔ یہ ادارہ کوئی خودکار وجود نہیں رکھتا، بلکہ امریکی صدر نے یالٹا کانفرنس ۱۹۴۵ء میں جنگ عظیم دوم کی دو فاتح طاقتوں: برطانیہ اور روس کے سربراہوں کے ساتھ ملاقات میں اپنے تمام مطالبات کو اقوام متحدہ پر مرکوز کیا اور دنیا کو منظم کرنے اور اپنے ڈھنگ پر چلانے کی منصوبہ بندی کی، جبکہ اس سے قبل جنگ عظیم اوّل کا نتیجہ چھ صدیوں پر محیط عظیم اسلامی سلطنت: خلافت عثمانیہ کی شکست وریخت کی صورت نکل چکا تھا۔ اقوام متحدہ کی لازمی شرائط کی پاسداری کرتے ہوئے سیکڑوں ریاستیں وجود میں آئیں اور اقوام متحدہ کا 'عالمی منشور برائے حقوق انسانی' ان ریاستوں کا آسمانی صحیفہ قرار پایا، اور اس کو تسلیم نہ کرنے والا تہدید وتعذیب کا مستحق ٹھہرا۔ اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء کے نام نہاد 'عالمی منشور انسانیت' UNHR میں تمام مغربی طاقتوں کی تائید سے اپنا یہ فریضہ قرار دیا کہ

Article 21: (1) Everyone has the right to take part in the government of his country, directly or through freely chosen representatives

(3) The will of the people shall be the basis of the authority of government, this will shall be expressed in periodic and genuine elections which shall be by universal and equal suffrage and shall be held by seeret vote or by equivalent free voting procedures.

"آرٹیکل ۲۱:(۱) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کئے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(۳) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے۔ اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے

1 https://www.bbc.com/urd

مساوی کسی دوسرے آزادانہ طریق رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔"

اسلام کی رو سے نہ تو ہر فرد اقتدار میں آنے کا حق رکھتا ہے، بلکہ یہ حق کی بجائے ان لوگوں کا فریضہ و خدمت ہے جو اہلیت: قوت و امانت میں عام مسلمانوں سے ممتاز ہوں۔ اور نہ ان کا تقرر عوام کی ووٹنگ کی بنا پر ہے۔ راقم نے اس موضوع پر شرعی دلائل سے مزین دو جامع مضامین میں اس موقف کے مثبت دلائل جمع کر کے، شبہات و اعتراضات کا ازالہ کر دیا[1] ہے۔ یہ دونوں حقوق اسی اللہ سے باغی انسان (ہیومن ازم) کے مادر پدر تصورِ آزادی کا نتیجہ ہیں، جو انکار (کفر) کے مظہر اور اسلام (اطاعت) کے نقیض ہیں۔ سادہ الفاظ میں مادر پدر آزادی کا نتیجہ معاشرتی حاکمیت کے نظریہ حق خود ارادی / استصواب رائے میں نکلتا ہے اور اسلام میں اللہ کی حاکمیت کا نتیجہ الٰہی حاکمیت کے تقاضے: دعوت و جہاد کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

جب حق خود ارادی Self Determination اور انسان پرستی Humanism سیاسی نظریے میں ڈھلتی ہے تو معاشروں کو اپنے من چاہے نظریات کی بنا پر تشکیل دیتی ہے۔ اور مخصوص علاقوں میں بٹ کر اکثریت کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اقلیت پر اپنی حکومت قائم کر لے۔ جبکہ نفس مسلم جب دعوت کے نتیجے میں اسلام کو قبول کر کے، بندگی و طاعت کا راستہ اختیار کرتا ہے، تو اپنی ذات کو اسلام پر کاربند کرنے کے لئے 'نفسی جہاد' (جہاد بالنفس) اور پھر دوسروں سے ظلم کا خاتمہ کرنے کے لئے 'اقدامی جہاد' کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

قومی ریاستوں (National States) کا نظریہ جہاں انسانیت میں جذبہ ہمدردی کی بجائے اپنے اپنے مفادات اور خود غرضی کا داعی ہے، وہاں عدل و انصاف اور خوبیوں کی بجائے نسلی قرابت کی بنا پر فیصلوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ نظریہ خود سری اور حقارت کو پروان چڑھاتا ہے اور وطن پرستی نے انسانیت کے زرخیز کھیت کو نامعقول سیمنٹ سے بنی دیواروں میں بانٹ کر انسانی اتحاد کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ قائم کر دی ہے۔ قومی ریاستوں کا اعجاز ہے کہ تاریخ میں پہلی بار نظریاتی حکومتوں کے بعد، مفاد پرستانہ وطنی ریاستوں کی تعداد دو صد سے تجاوز کر چکی ہے۔ ماضی میں اسی وطن پرستی نے برطانیہ و فرانس، ہالینڈ اور سپین اور پھر جنگ عظیم اول و دوم کی صورت میں قتل و غارت کی دردناک مثالیں قائم کی ہیں۔

حال میں ایک انسان کی شناخت، انسانیت کی بجائے علاقہ و ریاست کی مرہون منت ہے، جس کے بعد بالاتر قوم کے جانور بھی محکوم قوم کے انسانوں سے اہم تر ہو جاتے ہیں۔ بلند بانگ عظمت کے دعویدار انسانی حقوق کا انحصار بھی انسان کی بجائے شہریت پر ہے، اور اسی شہری کو حقوق دینے کی ریاست پابند ہوتی ہے، جو اس کی

---

[1] دیکھیں: مجلہ جہات الاسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور: 'حاکم کی اہلیت اور شرعی ضوابط' شمارہ دسمبر ۲۰۱۸ء، اور 'حاکم کے تقرر میں عوام کا کردار' شمارہ جون ۲۰۱۹ء۔

حدود میں آتا ہو۔ اس ظلم کا نتیجہ ہے کہ برما اور لیبیا کے انسان بپھرے سمندروں پر تختوں کے سہارے چھوڑ دیے جاتے اور 'مہذب دنیا' ان کو انسان سمجھ کر قبول کرنے سے انکاری ہو جاتی ہے۔ گویا انسانی حقوق دراصل 'شہری حقوق' ہیں۔

ہر ملک میں دو، تین لاکھ لوگوں کا کروہ جب چاہے منظم ہو کر، اپنے سیاسی حقوق کی آواز بلند کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں عراق و ایران اور ترکی میں بسنے والی کرد نسل کے مسلمان خلافتِ عثمانیہ کے تحت تو صدیوں پر سکون رہے، لیکن اب کردستان کے کے نام سے نئی ریاست کے لئے بڑھتے مطالبے آئے روز قتل وغارت اور جنگ وجدل کی فضا قائم رکھتے ہیں۔ ایسی ہی صورتحال بلوچستان کی بھی ہے، گویا اقوام متحدہ کے نام نہاد انسانی حقوق نے، انسان کو سیاسی اکائیوں میں تقسیم در تقسیم کی ترغیب دے کر نظریاتی وحدت اور انسانی اخوت کی بجائے مفادات اور خود غرضی کے ظالمانہ اور وحشیانہ نظام کو جاری وساری کر دیا ہے۔ اسی اُصول کے تحت ۲۰۰۱ء میں انڈونیشیا سے عیسائی 'مشرقی تیمور' بنا اور ۲۰۱۱ء میں سوڈان سے 'جنوبی سوڈان' علیحدہ ہو چکا ہے۔

اقوامِ متحدہ کے تحت انکارِ جہاد کا غیر شرعی ریاستی معاہدہ

انڈیا اور پاکستان کو بالترتیب ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۶ء میں آزاد ریاست کی حیثیت اس وقت ملی، جب اپنے دساتیر میں انہوں نے سرفہرست مغرب کے وضع کردہ انسانی حقوق کی پاسداری کو قانونی حیثیت دی۔ مذکورہ آرٹیکل کی دونوں شقیں اسلام اور مسلم روایات سے متصادم ہیں۔ اور بظاہر اقوام متحدہ کے اس 'مہذب فریضہ' کے بعد قائم ہونے والے قومی ریاست کے جبری نظام سے دنیا میں انسانوں کی ایک بڑی جماعت پر طاقت وقبضہ کے ذریعے حکومت کرنا ناممکن ہو گیا ہے، کیونکہ جو ملک بھی ایسا کرے گا، اس کو انسانی حقوق کی پامالی کے جرم میں، مغربی طاقتوں کی تائید یافتہ اقوام متحدہ اور اس کی کفریہ سکیورٹی کونسل کے قہر وعتاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عالمی جبری قانون کے اس آرٹیکل کا مطلب یہ بھی ہے کہ عملاً اقوام متحدہ کے ضوابط کی پاسداری پر قائم ہونے والی ریاستیں فریضہ جہاد سے منحرف ہونے کا عہد کرتی ہیں۔ اور کوئی بھی ریاست اقدامی جہاد یعنی طاقت کے ذریعے اللہ کی حکومت کو قائم کرنے کا 'جرم' کرنے کی مجاز نہیں رہی۔ یہی غیر شرعی معاہدہ پچاس سے زائد تمام مسلم ریاستیں بھی کر چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلم ریاستوں کے دساتیر میں جہاد کا نام ونشان بھی نہیں ملتا، اور ہر ملک میں وزیر جنگ کو 'وزیر دفاع' تو کہا جاتا ہے، ڈیفنس منسٹری تو ہوتی ہے، لیکن وزیر جہاد یا وزارتِ جہاد کا کسی مسلم ملک میں کوئی نام ونشان[1] نہیں ملتا۔

---

[1] اسی بنا پر پاکستان کے ایٹم بم کے دفاعی مقاصد کے لئے ہونے کی دہائی دی جاتی اور اعزاز کی بجائے اس کا تحفظ کرنا، مغرب نے پاکستان کے لئے مستقل دردِ سر بنا رکھا ہے۔

یاد رہے کہ متفقہ اسلامی احکام اور خیر القرون کی مسلمہ روایت کے مطابق جہاد اقدامی بھی ہوتا ہے اور دفاعی بھی۔ جہاد کو دفاع تک محدود کر دینا، مغربی طاقتوں کی آشیر باد سے بننے والی اقوام متحدہ کے بنائے عالمی نظام کا تقاضا ہے جو اسلام سے کھلا انحراف ہے۔ دوسری طرف اقدامی جنگ کی صلاحیت صرف انسانی حقوق کی نام نہاد، کفر کی سرکردہ طاقتوں پر مشتمل سیکورٹی کونسل کو حاصل ہے جو وہ افغانستان میں ۲۰۰۱ء میں طالبان اور پھر عراق میں داعش کے خلاف عملاً کر چکی ہے، جس کو جاوید غامدی جیسے سر پھرے منکر 'اقوام متحدہ کا جہاد' قرار دینے سے نہیں چوکتے۔ نبوی اصطلاح کے ساتھ اس سے بڑا مذاق اور کیا ہو سکتا ہے؟

اقوام متحدہ کے اس جابرانہ و کفریہ قانون کا ہی شاخسانہ ہے کہ افغانستان و عراق میں امریکہ خود حکومت کرنے کی بجائے، وہاں کے کٹھ پتلی علاقائی صدور و وزیر اعظم کو ان ممالک پر مسلط کرنے پر مجبور ہے۔ جہاں تک جہادِ افغانستان ۱۹۸۰ء کا تعلق ہے تو مغربی ممالک کے مفاد کی خاطر، دفاع کی حد تک جہاد کا نعرہ بلند کیا گیا، اور جب مغربی ایجنڈ اپورا ہو گیا تو وہی جہاد دہشت گردی بن گیا۔ رہا پاکستان کا جہادِ کشمیر تو وہ پاکستان کا ایسا داخلی نعرہ ہے جس کا خمیازہ مغربی طاقتوں اور اقوام متحدہ کے FATF کی آشیر باد سے اب پاکستان کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔

☆ مغرب کی الحادی اور سفاک و جابر طاقتوں کے بنائے عالمی ریاستی نظام نے جہاں عالمی سطح پر ملت کے جسد واحد کے نبوی مطالبے کو تار تار کر دیا ہے۔ وہاں ہر مسلم ریاست کے اندر حق خود ارادیت کے لئے قائم سیاسی جماعتوں کے ذریعے مسلمانوں کو کلمہ حق کی بجائے اپنی اپنی پارٹی کی عصبیت کے خلافِ قرآن نظریے کا اسیر بنا دیا ہے۔ اُمت کے ہر گروہ کو سیاسی مفاد کے نام پر ایک دوسرے سے نبرد آزما کر کے اسلامی اُخوت و ہمدردی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ پھر افسوس کہ کس طرح بعض تجدد پسند مسلمان جمہوریت کے اسی وطنی، افتراقی اور سیاسی نظریے کو اسلامی باور کرانا چاہتے ہیں، جس نے حق خود ارادیت کے متبادل 'اسلام کی کوہان جہاد' کا بھی بوریا بستر لپیٹ دیا ہے۔ پھر علمی زوال کی انتہا دیکھیے کہ اُمت میں غیروں کی مرعوبیت کے مارے دانشور اُٹھتے اور بہانگ دہل لوگوں کو اسلام بتا کر، اس کفر کی دعوت بھی دیتے ہیں کہ

"جدید قومی ریاست کے بارے میں ایک بنیادی احساس روایتی مذہبی اذہان میں ہے کہ اسے قبول کر لینا جہاد کی تنسیخ تسلیم کر لینے کے مترادف ہے۔ قومی ریاست کے جدید تصور میں جہاد کی گنجائش نہیں کیونکہ کسی بھی بنیاد پر دوسری ریاست کی جغرافیائی حدود یا انتظام کار میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یوں جہاد اور قومی ریاست میں تباین پایا جاتا ہے۔... فقہ اسلامی کی روایتی اور کلاسیکی تعبیر کے تناظر میں، مسلمان اور غیر مسلم ریاست کے مابین اصل تعلق جنگ کا ہی ہے۔ جدید قومی ریاست جہاد کی ذمہ داری میں ایک مانع کا درجہ رکھتی ہے۔... اس اصول پر دنیا کے اجتماعی اخلاقی ضمیر کا اجماع ہو چکا ہے اور کوئی طاقتور سے طاقتور حکومت بھی اس کی خلاف ورزی کرے تو اخلاقی اور قانونی

طور پر اس کا جواز تسلیم نہیں کیا جاتا۔"مختصر[1]

مدیر 'الشریعہ' جناب عمار خاں کے اس مختصر مضمون میں جابجا مغالطے اور مغربی نظریات کو اسلام میں داخل کرنے کی ناروا کوشش ہے۔ پہلے تو جہاد کے 'روایتی اور کلاسیکل موقف' کی پھبتی کسی گئی ہے، یعنی سارے ائمہ فقہا، محدثین کی تشریحات پر یک جنبشِ قلم سیاہی پھیر دی گئی، کیا یہی ہے صحابہ کرامؓ اور ائمہ فقہا کا احترام؟ پھر جہاد کو لازماً جنگ سے ہی تعبیر کیا گیا ہے، جبکہ مسلم سپہ سالار کے لئے مقابل کو دعوت و صلح کی پیش کش بھی شرعِ اسلامی کا ہی حصہ ہے۔ پھر اسلامی اصطلاح 'اجماع' کو پوری دنیا کے مسلم و کفار کے درمیان متفق بنا کر پیش کیا گیا ہے، حالانکہ یہ اجماع کب ہوا؟ اور کس نے اسے قبول کیا اور کونسی اسلامی حکومت اس امر کی مجاز ہے کہ قرآن کریم کے مسلمہ حکم جہاد کو منسوخ قرار دینے کا عالمی معاہدہ کرے، اور بصورتِ اجماع بھی اس خلاف قرآن عہد کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ کسی شرعی حکم پر فوری طور پر عمل پیرا نہ ہونا اور بات ہے، کہ ہر وقت ہر حکم زیر عمل نہیں ہوتا اور اس کے اُصولی جواز پر اعتراض کرنا اور اس سے دستبرداری پر اپنے قومی دساتیر میں مفاہمت کر لینا بالکل اور چیز بلکہ سراسر تحریف ہے۔

پھر ان کے سرپرست میدان میں آکر اسلامی عقائد کو پامال کرتے، حقائق سے نگاہیں چراتے اور کفر کی زبان بولتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ کشمیر پر حالیہ بھارتی ظلم کے حوالے سے ۲۳؍ اگست ۲۰۱۹ء کو بھارتی صحافی اروند سہارن کو ویڈیو بیان دیتے ہوئے جاوید غامدی نے ارشاد فرمایا کہ

"جہاد کسی مذہبی بنیاد پر نہیں بلکہ کسی اچھے مقصد کے لئے جدوجہد کرنے کا نام ہے جو ظلم وعدوان اور زیادتی کے خلاف ہوتا ہے، جیسا کہ طالبان کے خلاف ۲۰۰۱ء میں ۱۹ مغربی ممالک کی افواج نے اقدام کیا تو وہ عین جہاد ہے۔ جب اقوام متحدہ جنگ کا حکم دے تو وہ جہاد ہوتا ہے۔"[2]

اسلام کے نام پر مغربی مغالطوں کا فروغ

پیچھے مذکورہ نظریات و حقائق کو دیکھیں، اور مغرب پرستوں کی مغالطہ آرائیوں کو پڑھیں، اور اپنے علمی زوال کا نوحہ لکھیے کہ ایسا وقت بھی اُمتِ محمد ﷺ پر آنا تھا کہ کھلم کھلا اسلامی احکام کا مذاق اڑایا جاتا، اور اسلامی شعائر کے نام پر کفر کا بول بولا کیا جاتا۔ علمی زوال کی انتہا دیکھیے کہ ہر دم فقہی جمود اور مسلکی فرقہ واریت کی

---

1 'قومی ریاست اور جہاد' از عمار خاں ناصر... ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، جون ۲۰۱۸ء، ص ۳

2 ایک طرف اس بیان کو دیکھیں اور دوسری طرف اقوام متحدہ کے کشمیر پر کردار کا جائزہ لیں جس کو اسی شمارے کے مستقل مضمون میں پیش کیا گیا ہے تو عجب تضادات سامنے آتے ہیں۔ کیونکہ اقوام متحدہ کی ہدایت پر ظلم کے خلاف جہاد کرنا تو کجا، یہ ادارہ خود کفر و ظلم کا سب سے بڑا محافظ نظر آتا ہے۔

دعوت دینے والے، جب مغرب نوازی پر آتے ہیں تو فقہا کے بارہ صدیوں پر محیط مسلسل موقف سے یہ کہہ کر جان چھڑانا چاہتے ہیں کہ یہ سارا تو دورِ عروج کا فقہی بیانیہ ہے۔ ہمیں اب دورِ زوال کا فقہی موقف از سر نو ترتیب دینا ہوگا۔ کوئی زیادہ خود سر، اپنے مخصوص ماحول میں ائمہ کرام کا نام نہ لے سکیں تو اس ساری فقہ کو 'کلاسیکل فقہ' قرار دے کر، گویا امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور ائمہ محدثین رحمہم اللہ اور ان کے نشانات قدم پر چلنے والے ہزاروں علما وفقہا کی سیکڑوں کتب پر محیط علمی ذخیرے پر بیک قلم خطِ تنسیخ پھیر دیتے ہیں اور اپنے تئیں اسلام کی اس روایتی تشریح سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن وسنت تو کسی مخصوص دور کے لئے نہیں اور قرآن وسنت کا ہر حکم ہر زمان ومکان اور ہر اُمتی کے لئے واجب الاتباع ہے۔ اب قرآن وسنت میں جہادِ اقدامی یا حاکم کے دینی فرائض پر دسیوں صریح آیات واحادیث موجود ہوں تو کلاسیکل فقہ قرار دے کر اس سے پیچھا چھڑانا ایسے ہی ہے جیسا کہ آج کل لبرل لوگ قرآن وسنت کے دوٹوک احکام کو جب برا نہیں کہہ سکتے تو ان کی نشاندہی کرنے والے علماے کرام کی مذمت کرکے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

☆ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام کیا شخصی آزادی کا قائل نہیں؟ اور کونسی مجبوری ہے کہ حق خود ارادیت اور مفاہمت کے ذریعے اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ اسلام انسان کو قبول اسلام سے قبل ہر طرح کی مذہبی آزادی دیتا ہے، لیکن اس بات کی آزادی نہیں دیتا کہ اسلام (اطاعت) کا نام لینے اور محمد ﷺ کا کلمہ پڑھ لینے کے بعد، وہ اعتقادی اور عملی نفاق کا شکار ہو۔ جی چاہے تو نماز پڑھے اور جی چاہے تو سود کا کاروبار چلائے۔ جی چاہے تو چوری سے بچے اور کبھی من چلے تو بدکاری بھی کر ڈالے۔ اسلام ہم سے پورے دین میں داخل ہونے بلکہ ہر نظام ہی کامل اتباع کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور بعض دین کو ماننا، بعض دین کو ترک کر دینا قرآن کی رو سے نفاق ورسوائی اور آخرت میں عذابِ عظیم کا شاخسانہ ہے۔ اسلام کی ساری مفاہمت قبولِ اسلام کے وقت موجود ہے، لیکن پوری آزادی سے اسلام میں داخل ہونے کے بعد پھر اسلام کو ترک کرنا بھی قابل گردن زدنی ہے۔ اس کے بالمقابل جمہوریت ایک ایسا خود ساختہ مغربی نظام حیات ہے جہاں ایک ہی معاشرے میں بیک وقت حاکم محکوم موجود ہوتے ہیں، اور اکثریت جس وقت جتنا قانون بنانا اور اختیار کرنا چاہے، اس کو قائم اور جاری کر سکتی ہے۔ چاہے تو زکاۃ کو جاری کر دے، اور چاہے تو شیعہ کو مستثنیٰ کر دے، اور چاہے تو سود کو سندِ قبولیت دے دے، چاہے تو جہاد دفاعی کو قبول کرے اور جہادِ اقدامی کو منسوخ کر دے۔ لیکن کفر سے ایسی اُصولی مفاہمت، اسلام میں داخل ہونے کے بعد مسلمان کے لئے بالکل روا نہیں، بلکہ اللہ کا پورے دین میں داخل ہونے اور کامل اطاعت کو اس کے لئے مختص کر دینے کا مطالبہ ہے، جبکہ جمہوریت کا حاکمانہ نظریہ اس میں اُصولی تفریق قبول کرتا ہے۔

☆ کہا جاتا ہے کہ پاکستان جہاد کی بجائے اقوام متحدہ کے نظریہ خود ارادی پر قائم جمہوری ووٹوں کے نتیجے

میں بنا، جن دونوں کو یکجا کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ نے کلمہ طیبہ 'پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ' کا نعرہ لگایا تھا۔ اس طرح جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ثابت ہوئی، وہاں پاکستان کے نام سے علیحدہ ریاست بنانے کا فیصلہ ہوا۔ بہر طور پاکستان کا مطالبہ اور نظریہ اس پہلے جمہوری الیکشن ۱۹۳۷ء سے پہلے بھی علامہ اقبال پیش کر چکے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد قرارداد مقاصد نے پاکستان کا رخ تو متعین کر دیا جو بعد ازاں قومی دستور ۱۹۷۳ کا لازمی حصہ بھی بن گیا، لیکن عملاً ملک کو آزادی اقوام متحدہ کی گائیڈ لائن پر بنے ہوئے ایسے دستور پاکستان کی تشکیل ۱۹۵۶ء کے بعد حاصل ہوئی جس میں انسانی حقوق کو بالاترین حیثیت دی گئی تھی۔ بعد ازاں ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلام کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی اور ملک کے دو نظریاتی محور قرار پائے۔

پاکستان میں اس اصولی تفریق کا نتیجہ ہے کہ پورا ملک اپنی شناخت کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ ہر ہر حکومتی مرحلے اور ادارے میں دوغلا کردار جاری وساری ہے۔ ملک کے نام کے طور پر اسلامی اور جمہوریہ بیک وقت، دستور میں دیکھیں تو آرٹیکل ۸ میں انسانی حقوق بالاترین، اور آرٹیکل ۲۲۷ اور ۲۰۳ میں شریعت بالاتر، قومی ترانے میں پاک سرزمین کا نظام 'قوتِ عوام' میں مذکور ہے تو قرارداد مقاصد میں 'اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق' ہے۔ سیاسی نظام میں دیکھیں تو عوامی حاکمیت کے لئے ان کے نمائندوں پر مشتمل پارلیمان اور اسلامی مشاورت کے لئے علمائے کرام پر مشتمل متوازی اسلامی نظریاتی کونسل، عدالتوں کو دیکھیں تو انگریزی قانون کی پروردہ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس اور ان کے متوازی وفاقی شرعی عدالتیں، قوانین کو دیکھیں تو چوری، زنا، شراب اور نکاح پر متوازی قوانین دستیاب ہیں۔ معاشی نظام میں دیکھیں تو سٹیٹ بنک کی سرپرستی میں بنکوں میں جاری سودی کاروبار اور کرنسی چھاپنے کا حکومتی کھیل، اور اس کے متوازی بیت المال، صوبائی زکوٰۃ کونسلیں بھی کام کر رہی ہیں۔ تعلیمی نظام میں دیکھیں تو سیکولر تعلیم کو فروغ دینے والی یونیورسٹیاں اور کالجز، اور اس کے متوازی اسلامی نظام تعلیم کے نمائندہ بچے کھچے دینی مدارس کی حکومتی رجسٹریشن بھی جاری ہے۔ ابلاغی ذرائع میں الحادی نظریات کو پھیلانے والے ٹی وی چینلز کے ساتھ ساتھ، محدود دینی موضوعات کی تبلیغ کرنے والے مذہبی چینلز بھی آن ایئر ہیں۔ رہنمائی دینے کے لئے نام نہاد ٹی وی مذہبی سکالرز بھی دستیاب ہیں اور نکاح وطلاق کے لئے علمائے کرام کے فتویٰ بھی چل رہے ہیں۔ ان تمام متوازی اداروں میں غالب کون ہے اور برائے نام کردار کس کا ہے، اس کا تجزیہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ لیکن یہ ایک امر طے شدہ ہے کہ پاکستان جیسی اسلام کی تجربہ گاہ میں ہم نے ابھی تک اپنی سمت کا فیصلہ نہیں کیا، ہم دراصل رحمٰن کو راضی کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور شیطان کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اور ایک پر تعیش اور من چاہی زندگی کے ذریعے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے اُخروی نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ☆☆

سو فیصد تعلیم یافتہ مغلیہ اسلامی ہندوستان کو ان پڑھ کس نے بنایا؟

اوریا مقبول جان

شاید چند برسوں بعد کوئی اس قافلے کے لٹنے کا ماتم کرنے والا بھی میسر نہ ہو۔ آج یہ داستان رقم کر دو، مرتب کر دو کہ شاید گرد آلود الماریوں میں موجود بوسیدہ کتابوں سے آج سے کئی سال بعد کسی کو اس تہذیب کے لٹنے اور برباد ہونے کا سراغ مل جائے۔ تہذیبیں آہستہ آہستہ اُجڑتی ہیں اور لوگ نئی تہذیب کو بھی آہستہ آہستہ اوڑھتے ہیں۔ لیکن اگر کسی منصوبہ بندی سے تبدیلی لائی جا رہی ہو تو اس کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اور دوسری بات یہ کہ تبدیلی لانے والے گذشتہ تہذیب کے نشان تک بھی مٹا دیتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلم تہذیب کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔ پوری دنیا میں علم و عرفان اور تہذیب و ترقی کی علامت یہ تہذیب اب صرف چند ناقابل رواں، عالی شان عمارتوں کی صورت دنیا کے نقشے پر موجود ہے جسے اب ان عمارات کے فنی محاسن کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان عظیم فنکاروں، کاریگروں، کاشی کاروں اور منبت کاروں [نقش گری] کے فن کی داد، تاج محل سے شیش محل اور فتح پور سیکری سے قطب مینار تک ہر جگہ دی جاتی ہے، لیکن آج کوئی اس تہذیب کی کہانی سنانے والا موجود نہیں۔ ان علمی مراکز کے قصے کوئی بیان نہیں کرتا جن کی تعلیم و تربیت سے ایسے نابغہ روزگار فنکاروں نے جنم لیا۔ کوئی اس معاشرے کی داستان نہیں سناتا، جس کے ذوق سلیم اور حس جمالیات کا یہ عالم تھا کہ ان کے آباد کئے گئے شہروں کی کوئی چھوٹی سی عمارت بھی ایسی نہ تھی جو حسن و خوبی سے آراستہ نہ ہو۔

ان عمارتوں میں بسنے والے کیسے تعلیمی اداروں میں علم حاصل کرتے تھے۔ کن علما کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی جمالیاتی حس کی آبیاری کرتے تھے اور ان کے اردگرد کونسا ایسا ماحول تھا جس نے اس عظیم باذوق معاشرے کو حسن ترتیب سے آراستہ کر رکھا تھا۔ برصغیر پاک و ہند کا یہ معاشرہ جو سترہویں صدی تک اپنے بام عروج پر تھا اور جس کی بنیاد گیارہویں صدی میں اس وقت رکھی گئی جب قطب الدین ایبک کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد دلی اور لاہور کے دو تہذیبی مراکز کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۱۹۲ء سے ۱۷۶۵ء تک ساڑھے پانچ سو سال تہذیبی ارتقا کے سال ہیں۔ ان برسوں نے ایک ایسے ہندوستان کو جنم دیا جس کی تو سے فیصد آبادی پڑھی لکھی تھی اور جس کی عام زندگی میں بھی گفتگو کے موضوعات اپنے زمانے کے دنیا بھر کے تمام علمی مراکز میں ہونے والی فلسفیانہ گفتگو اور تخلیقی مباحث سے بہتر تھے۔ اس تہذیب کے زوال کے دنوں میں بھی جو چند یورپی

سیاح اور افسران یہاں آئے جن میں برطانوی سفارتکار سر تھامس رو اور لارڈ میکالے شامل ہیں، اُنہوں نے بھی اپنے تعصب کے باوجود یہاں کے علمی ماحول اور سماجی جمالیات کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس کی چھوٹی سی جھلک بھی اس دور کی معربی دنیا کے علمی مراکز میں نظر نہیں آتی تھی۔

سر مورخ یا ماہر آثار قدیمہ جب کسی خطے کی تاریخ مرتب کرتا ہے تو پہلا سوال جو وہ اپنے آپ سے کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس قدر عظیم الشان عمارات بنائیں اور اس قدر آراستہ شہر آباد کئے، ان کا علمی و تہذیبی مقام و مرتبہ اور سائنسی و تحقیقی معیار کیا ہوگا؟ دنیا کی ہر تہذیب کے بارے میں یہ سوال پوچھا جاتا ہے اور اس کے جواب میں سرگرداں ہو کر کتابوں پر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً مصر کے اہرام، بابل کے لٹکتے باغات، سائرس اعظم کے محلات، روم کے کھیلوں کے میدان، چین کی نیرا کوٹا فوجی مجسمے اور یونان کے پارتھنون کو دیکھنے کے بعد ہر مورخ وہاں کے علمی خزانوں اور تعلیمی مراکز کا سراغ لگاتا ہے جہاں سے ایسے مایہ روزگار لوگ پیدا ہوئے، جنہوں نے نہ صرف یہ عمارتیں تخلیق کیں بلکہ ان عمارتوں میں ایک چلتی پھرتی، ہنستی بولتی جمالیاتی زندگی کو بھی آباد رکھا۔

لیکن برصغیر کے ساتھ یہ تعصب برتا گیا کہ ان پانچ سو برسوں کے علمی مراکز اور تہذیبی ماحول کو جان بوجھ کر گرد آلود کر دیا گیا۔ ان پر کوئی تحقیق نہ کی گئی اور آج لوگوں میں یہ تصور عام ہو چکا ہے کہ ہم شاید جاہل، گنوار اور ان پڑھ رہ جاتے، اگر یہاں انگریز نہ آتا اور وہ انگریزی تعلیم کے ادارے نہ کھولتا۔ آج کا نوجوان یہ سمجھتا ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے پورا برصغیر جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا، بادشاہ اور اُمرا عالی شان عمارتیں اور محلات بنانے میں مصروف تھے اور خلق خدا روکھی سوکھی کھا کر زندگی گزار رہی تھی۔ انگریز آیا اور اس نے یہاں علم کی شمع روشن کی، کالج اور اسکول کھولے اور ہمیں مغربی دنیا کے علمی ورثے سے منسلک کیا۔ اسی وجہ سے آج ہم تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں۔ یہ ہے وہ عام تاثر جو گذشتہ سو برسوں سے ہمارے مؤرخین دانشور ادیب صحافی اور تاریخ دان اپنی تحریروں اور لچھے دار گفتگو سے قائم کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے سے ہم اپنے ماضی پر شرمندہ اور مستقبل سے مایوس قوم بن چکے ہیں۔

ان مغرب زدہ مؤرخوں اور دانشوروں نے ہمارے ماضی سے متعلق بے تحاشہ جھوٹ بول کر ہمیں اس سے برگشتہ کیا اور ہمیں مغربی تہذیب و علم کے سہانے خواب دکھائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے ماضی پر شرمندہ ہیں مگر ہم اپنے مستقبل سے بھی اس لئے مایوس ہو چکے ہیں کیونکہ ہم آج تعلیمی اداروں میں جو علم حاصل کر رہے ہیں اس کی کھپت ہمارے معاشروں میں نہیں۔ ہماری صلاحیتوں کا عروج ہی مغرب کے قائم کردہ معاشروں میں ہوتا ہے۔ ہم یہاں ایک ایسا ناکارہ وجود ہیں کہ جس نے جتنا علم حاصل کیا ہے اور جیسی تہذیب کو اوڑھنا بچھونا بنایا ہے، جن سیکولر، لبرل اقدار کو ہم نے دل و جان سے چاہا ہے، ایسا ماحول ہمیں اپنے معاشرے

میسر نہیں۔ اس لیے ہر آنے والی نسل اپنے، اپنی قوم اور ملک کے مستقبل سے مایوس ہے اور یہ مایوسی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ وہ مغرب میں جاکر آباد ہونا چاہتی ہے جہاں اس کی صلاحیتیں پروان چڑھیں اور وہ اپنی مرضی کے ماحول میں زندگی گزار سکے۔

اس مایوسی کا صرف اور صرف ایک ہی علاج ہے کہ اپنے ماضی کی عظمت کا صحیح ادراک حاصل کیا جائے اور اس کی تباہی کے ذمہ دار کرداروں کا تعین کرنے کے بعد ایک دفعہ پھر اسی ماضی کی عظمت رفتہ کی بنیاد پر اپنے مستقبل کی نئی عمارت کی تعمیر کی جائے۔ ؎

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ　　کہ یہی ہے اُمتوں کے مرض کہن کا چارہ

سب سے پہلے اس علم و تہذیب کے زوال کے عوامل اور ان کرداروں کا جائزہ لیں کہ اسی زوال کی داستان میں ہی ہماری عظمت رفتہ کی تہذیبی بالادستی بھی پوشیدہ ہے اور ہمارے دوستوں اور دشمنوں کے چہرے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے برصغیر پاک و ہند میں آمد سے پہلے پورا خطہ علم و آگہی کا ایک گہوارہ تھا۔ دنیا بھر میں غیر رسمی تعلیم کو متعارف کروانے کا سہرا ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے سر جاتا ہے۔ ہندوستان کے ہر گاؤں میں ایک اتالیق مقرر تھا بلکہ اکثر جگہوں پر دو اتالیق (ایک مسلمان، دوسرا ہندو) مقرر تھے۔ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ ہر فرد کو فارسی زبان اس قدر سکھاتے تھے کہ وہ کتاب پڑھ سکے اور عرضی نامہ لکھ سکے۔ اس کے علاوہ اسے حساب کتاب بھی سکھایا جاتا تاکہ وہ سودا بیچ سکے، خرید سکے اور مالی معاملات میں کسی کا محتاج نہ ہو۔ جب کہ مسلمان کو قرآن پاک پڑھایا جاتا تھا اور ہندو کو وید اور گیتا۔ یوں پورا ہندوستان ایک ایسا تعلیم یافتہ معاشرہ تھا جو نوے فیصد تک پڑھا لکھا تھا۔

اس حقیقت کا اعتراف جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب The Discovery of India میں کیا ہے جو اس نے اپنی قید کے چار برسوں میں تحریر کی، جب وہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک احمد نگر کے قلعے میں انگریز کی قید کاٹ رہا تھا۔ یہ کتاب ان شواہد پر مبنی ہے جو برطانیہ میں انگریزوں کے آنے سے پہلے عالی شان تہذیب کلچر فلسفہ اور علم و عرفان سے متعلق تھے۔ نہرو نے مغلوں کے اس ہندوستان کی بات کی ہے جس میں نہ صرف ہر شخص پڑھا لکھا تھا بلکہ پورے ملک میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ایک ایسا جال بچھا ہوا تھا جہاں اپنے زمانے کی اعلیٰ ترین تعلیم دی جاتی تھی۔ انگریز کے کلکتہ آنے سے پہلے اور بنگال میں اپنی حکومت کے قیام تک تین بڑے تعلیمی مراکز تھے جن کے زیر سایہ بے شمار تعلیمی ادارے ان کے نصاب کے مطابق تعلیم دیتے تھے:

۱۔ لکھنؤ کا فرنگی محل　　۲۔ دلی کا مدرسہ رحیمیہ　　اور ۳۔ خیر آباد کا جدید سائنسی علوم کا سکول

اورنگزیب عالمگیر (م ۱۷۰۷ء) کا ہندوستان اپنے دور میں آباد دنیا کی تہذیبوں میں علم و عرفان کا ایک درخشندہ ستارہ تھا۔ ایک ایسا خطہ جس میں گلی گلی اور گاؤں گاؤں سکول کالج اور یونیورسٹیاں لوگوں کو زیور تعلیم

سے آراستہ کر رہی تھیں۔ اس عظیم علمی میراث کی گواہی کسی مسلمان مؤرخ یا ہندوستان میں آباد شاہی وظیفہ خوار ہندو لکھاری نے نہیں بلکہ انگریز حملہ آوروں نے دی ہے، جنہوں نے حکومت سنبھالنے کے بعد اس سارے علمی ماحول کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ ہندوستان کے عظیم نظام تعلیم کی پہلی گواہی ایک برطانوی پادری ولیم ایڈم نے اپنی ان تین رپورٹوں میں دی ہے جو اس نے گورنر جنرل کے کہنے پر تحریر کیں تھیں۔ یہ شخص ۱۸۱۸ء میں ہندوستان آیا اور اس نے یہاں ۷ سال گزارے۔ اس دور میں گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹک نے اسے بنگال اور بہار کے تعلیمی نظام کے سروے کی ذمہ داری سونپی تاکہ برصغیر کے تعلیمی نظام میں اصلاحات کی جا سکیں۔

اس نے اپنی پہلی رپورٹ میں تحریر کیا ہے کہ بنگال اور بہار میں تقریباً ایک لاکھ سکول ہیں جو بنیادی تعلیم فراہم کرتے ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق سکول جانے کے قابل ہر ۳۲ لڑکوں کے لیے ایک سکول میسر ہے۔ اس رپورٹ کے بعد اس نے ان سکولوں کے نظام کار کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لئے، ضلع راج شاہی کے قصبے نلتور کو منتخب کیا جس کی آبادی ۱۲۹،۶۴۰ تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ یہاں دو قسم کے سکول ہیں، ایک رسمی تعلیم کے سکول جن میں جدید تعلیم دی جاتی تھی اور دوسرے گھریلو سکول، جہاں ایک استاد یا اتالیق پورے خاندان کو ایک ساتھ بٹھا کر تعلیم دیتا ہے۔ رسمی تعلیم والے سکول میں داخلے کی اوسط عمر آٹھ سال ہے اور پانچ سال تعلیم کے بعد اوسط ۱۴ سال کی عمر میں ایک لڑکا فارغ التحصیل ہو جاتا ہے۔ نلتور کی اتنی چھوٹی سی آبادی میں بھی گیارہ سکول تھے جو عربی زبان میں تعلیم اور قرآن پڑھانے کے لیے مخصوص تھے، جبکہ دس بنگالی میں تعلیم دیتے تھے اور چار فارسی میں۔ ہر کسی کو آزادی تھی کہ وہ پرائمری تعلیم عربی، فارسی یا بنگالی کسی ایک میں حاصل کرے۔ اوسطاً ایک اسکول میں دس سے پندرہ طلبہ زیر تعلیم تھے۔

اسی عرصے میں یعنی ۱۸۲۲ء سے ۱۸۲۶ء تک مدراس کے علاقے میں بھی علاقائی نظام تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے سروے کیا گیا۔ یہ رپورٹ Survey of indigenous education in Madras presidency کے نام سے شائع ہوئی۔ اس رپورٹ کے مطابق اس علاقے میں ۱۲،۴۹۸ سکول تھے جن میں ۸۸،۶۵۰ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ ایسا ہی سروے بمبئی کے علاقے میں بھی ہوا اور وہاں بھی ہر تیس طلبا پر ایک سکول کی موجودگی پائی گئی۔ پنجاب کے بارے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل گوٹلب ولیم لائٹنر کی ہزاروں صفحات پر مشتمل کتاب History of indigenous education in Punjab وہ مہر تصدیق ہے کہ جس میں ہر گاؤں میں موجود اُستادوں کے نام، طلبہ کی تعداد، مضامین کی اقسام اور معیار تعلیم کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ یہ تو ان سکولوں کا تذکرہ ہے جو رسمی تعلیم دیتے تھے۔ جبکہ دیہاتوں میں ایسے استاد اور اتالیق مقرر تھے جو گھروں میں تعلیم دیتے تھے، ان کی وجہ سے ہر شخص ایک پڑھی لکھی، مہذب دنیا کا

فرد نظر آتا ہے۔

ایڈورڈ تھامسن ایک برطانوی ادیب اور ناول نگار تھا۔ اس نے بنگالی ادب کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے بہت کام کیا۔ اس کے مطابق ہندوستان کے بازار کا ماحول بھی ایک پڑھے لکھے معاشرے کا نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ 'ہندوستان کے غریب عوام جو کسی بھی سکول میں پڑھنے نہیں گئے، وہ بھی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ یقیناً ان لوگوں کے لئے علم حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ ہو گا، ورنہ جتنے سکول یہاں موجود ہیں ان کے حساب سے کئی گناہ زیادہ پڑھے لکھے افراد یہاں پائے جاتے ہیں۔ ہر بنگالی بازار میں کتابوں کی دکانوں کی بھرمار ہے اور کتب کی فروخت لاکھوں میں ہے۔'' اس نے لکھا ہے کہ مشہور بنگالی ناول نگار سرات چندر چیٹرجی جس نے 'دیوداس' ناول تحریر کیا تھا، اس نے بتایا کہ اس کے اس ناول، جس کی قیمت صرف بارہ آنے تھی، اس نے اسے بارہ ہزار روپے رائلٹی فراہم کی، جس کا مطلب ہے کہ دیوداس کے دو لاکھ نسخے فروخت ہوئے۔

عام آدمی پڑھا لکھا بھی تھا اور رعایا کے بچوں کے لئے پرائمری سکول کی تعلیم کا بھی اہتمام تھا۔ بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۳۰ء تک بمبئی صوبے کے دیسی نظام تعلیم کا سروے کیا گیا، جس کے مطابق صرف احمد نگر میں ۱۶ بڑے کالج موجود تھے اور پونا شہر میں ۱۶۴ کالج اعلیٰ تعلیم کے لئے مخصوص تھے۔ جبکہ پورے صوبے بمبئی میں ۲۲۲ بڑے کالج اور یونیورسٹیاں موجود تھیں۔ یہی حال مدراس کے علاقے کا تھا جہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۰۱ کالج موجود تھے۔ سب سے زیادہ کالج، ۲۷۹ راج مندر میں تھے جبکہ ترچن لوبائی میں ۱۷۳، بنگلور میں ۱۳۷ اور تنجور میں ۱۰۹ کالج تھے۔ ان کالجوں میں ۵۴۳۱ طلبہ کو قانون، فلکیات، فلسفہ، شاعری، جہاز رانی، طب، فن تعمیر اور آلاتِ حرب بنانے کے علوم سکھائے جاتے تھے۔

کروشیا کا ادیب 'فراپاولینو دی بارٹولومیو' جو بعد میں رومن چرچ سے وابستہ ہو گیا تھا، اس نے ہندوستان کے تعلیمی و ادبی ماحول پر بہت کام کیا ہے۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے سنسکرت کی گرامر تحریر کی تھی۔ یہ ۱۷۷۴ء میں ہندوستان آیا اور یہاں اس نے ۱۴ سال گزارے۔ یہ زبانوں کا ماہر تھا، یہ بیک وقت جرمن، لاطینی، یونانی، عبرانی، رومن، پرتگیزی، انگریزی، سنسکرت اور ہندوستان کی دیگر کئی زبانیں بول سکتا تھا۔ اس نے ۱۷۹۸ء میں جس ہندوستانی تعلیمی نظام کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس کے مطابق یہ اپنے دور کی موجود دنیا کا سب سے بہترین اور اعلیٰ پائے کا تعلیمی نظام تھا، جس میں ایسے تمام فکری، مابعد الطبیعاتی اور سائنسی علوم پڑھائے جاتے تھے جن کا تصور بھی یورپ میں نہیں ہوتا تھا۔

مسلمان بادشاہوں کا کمال یہ تھا کہ ان کے آنے سے پہلے برصغیر میں تعلیم صرف اور صرف برہمنوں اور شاہی خاندانوں تک محدود تھی، لیکن مغلوں کے دیے گئے نظام ہائے تعلیم نے ہر رنگ اور نسل کے بچے کو زیورِ

تعلیم سے آراستہ کر دیا۔ انگریزوں نے جب بنگال میں ذات پات کے حوالے سے پہلا سروے کیا تو وہ حیران رہ گئے کہ ۸۹۰.۵ء ابتدائی طالب علموں میں صرف ۲۴ فیصد یعنی ۵۰۲, ۴۲ برہمن نسل کے تھے، جبکہ ۲۶۹, ۱۹ ویش اور ۴۰۰, ۸۵ شودروں کے بچے تھے۔ ٹیپو سلطان کے میسور کے سکولوں میں ۶۵ فیصد شودر بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ ان تمام علاقوں کا حال ہے جو دلی دربار سے دور تھے، جیسے بنگال، بہار، اڑیسہ، مدراس، میسور، پنجاب وغیرہ۔ یہاں انگریز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بہت پہلے آ گیا تھا اور اس نے وہاں حکومتیں بھی بنالیں تھیں۔ اسی لئے اس نے یہاں کی تہذیب اور تعلیمی ماحول کو بدلنے کے لئے سروے کیے تھے اور یہی سروے پورے ہندوستان کے تعلیمی ماحول کی گواہی دیتے ہیں۔

لیکن اس دور دراز ہندوستان کے علاوہ دلی اور اس کے ملحقہ علاقے تو علم و عرفان کے مراکز تھے جنہیں دبستان (Seats of Learnings) کہا جاتا تھا۔ یہاں کے مدرسہ رحیمیہ، فرنگی محل، اور خیر آباد سکول پورے ملک کے لئے اعلیٰ ترین نصابی تعلیم مرتب کرتے تھے، اساتذہ کی کھیپ تیار کرتے تھے اور یوں پورا ہندوستان ایک مربوط تعلیمی نظام سے منسلک تھا۔ یہ وہ دور تھا جب برطانیہ کا نظام تعلیم سولھویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے وسط تک ایسے مضامین سے ناآشنا تھا جو ہندوستان میں پڑھائے جاتے تھے۔ پورے برطانیہ میں اٹھارویں صدی تک صرف ۵۰۰ گرامر سکول تھے اور ان میں بھی تعلیم صرف اور صرف اعلیٰ نسل (Elites) کے بچوں تک محدود تھی۔ اے ای ڈوبز (A. E. Dobbs) کی ۱۹۲۰ء میں چھپنے والی کتاب (A Short History of Education) برطانیہ کے تعلیمی نظام کی پسماندگی اور اس کے خاص طبقوں تک محدود ہونے کے المیے کی داستان ہے۔

آکسفورڈ جیسے سب سے بڑا خیراتی ادارہ اور سب سے بڑا گرامر سکول سمجھا جاتا تھا، وہاں بھی طبقاتی نظام تعلیم رائج تھا۔ برطانیہ میں یہ قانون رائج تھا کہ ”کوئی شخص اپنے بچے کو اس وقت تک سکول میں داخل نہیں کرے گا جب تک اس کی زمین یا مکانوں کے کرائے کی آمدنی ۲۰ شیلنگ سے کم نہ ہو۔“ سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں جب مغلیہ ہندوستان میں سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہر کوئی بلا تخصیص مذہب، رنگ، نسل اور ذات پات، اپنے بچوں کو سکول میں داخل کرا سکتا تھا تو اس وقت برطانیہ میں تعلیم صرف اشرافیہ کے بچوں تک محدود تھی۔ آکسفورڈ کمیشن کی رپورٹ جو ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی، اس کے مطابق برطانیہ میں یہ قانون نافذ تھا کہ ”کوئی شخص اپنے بچے کو تعلیم کے لئے نہیں بھیجے گا جب تک اسے زمین یا مکانوں کے کرایے سے ۲۰ شلنگ آمدن نہ ہوتی ہو۔“

بائبل کا انگریزی ترجمہ ہو چکا تھا مگر اسے عام آدمی کی دسترس سے دور رکھنے کے لئے گرجا گھروں میں پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ ۱۷۸۰ء میں سنڈے سکول تحریک شروع ہوئی، جس نے عام آدمی کو تعلیم کے حق

کے لیے آواز اٹھائی۔ اس کے نتیجے میں ۱۸۰۲ء میں Peel's Act آیا جس کے تحت عام بچوں کے لئے بھی پڑھنا لکھنا اور حساب سیکھنا لازم قرار دے دیا گیا۔ تعلیم کا یہ طریقہ جو برطانیہ میں جوزف لنکاسٹر اور اینڈریو بیل نے شروع کروایا، دراصل مغلیہ ہندوستان کے اتالیق سسٹم سے مستعار لیا گیا تھا۔ جس دور میں ہندوستان میں لاکھوں کے حساب سے سکول کام کر رہے تھے، ۱۸۰۱ء کے انگلینڈ میں صرف ۳۶۳، ۳ سکول اور طلبا کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ ۱۸۱۸ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۸۸۳، ۷۴، ۶ ہوئی اور ۱۸۵۱ء میں ۷۷، ۳۴، ۴۴، ۲۱ طلبہ سکول میں علم حاصل کر رہے تھے اور اسکولوں کی تعداد بھی بڑھ کر ۱۱۴، ۴۶ ہو چکی تھی۔ دوسری جانب انگریز حکمرانوں نے برصغیر کے صدیوں پرانے تعلیمی نظام کی تباہی کا پورا خاکہ تیار کر لیا تھا۔

یہ نظام تعلیم دین و دنیا دونوں علوم کا احاطہ کرتا تھا۔ تفسیر اور حدیث کے ساتھ ساتھ منطق، فلسفہ، علم ریاضی، جیومیٹری، الجبرا، علم الہندسہ، طب، گرامر، ادب اور فن تعبیرات پڑھائے جاتے تھے۔ ان مدارس سے ایک ایسی نسل برآمد ہوتی تھی جو ہندوستانی سول سروس، عدلیہ، صحت، تعلیم اور تعبیرات جیسے تمام شعبوں میں اپنی کارکردگی دکھاتی تھی اور جو اپنے اپنے مذاہب کے علم سے بھی آراستہ ہوتی تھی۔ اس تعلیمی نظام کی داغ بیل شاہ عبدالرحیم نے ڈالی تھی جنہوں نے بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فرمائش پر فتاویٰ عالمگیری مرتب کی۔ ان کے مدرسہ رحیمیہ کا ہی نصاب تھا جو سب کے لیے قابل قبول تھا۔ اس وقت تک دین اور دنیا کی تعلیم میں کوئی امتیاز نہ تھا اور نہ علیحدہ علیحدہ مدارس تھے۔ ایک ہی سکول کالج اور یونیورسٹی دونوں علوم ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔

اس جامع نظام پر پہلی کاری ضرب گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے لگائی۔ اس نے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جس کا کام بنیادی طور پر شرعی قوانین کی تعلیم تھی، اس لیے کہ ہندوستان میں ابھی تک فقہ حنفی کے تحت شرعی عدالتیں کام کرتی تھیں اور اسے اپنے اہل کاروں کو یہ تعلیم دلوانا تھی۔ اس مدرسے میں پہلی دفعہ 'ہدایہ' اور 'سراجیہ' کا انگریزی ترجمہ کیا گیا۔ یہ اپنی طرز کا پہلا انوکھا سکول تھا جس میں صرف فقہ اور شرعی قوانین پڑھائے جاتے تھے۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ تفسیر اور حدیث بھی نصاب میں شامل تھی۔ یوں جب برصغیر میں انگریز نے پہلا علیحدہ دینی مدرسہ قائم کر دیا تو برطانیہ میں عیسائی مشنریوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق شور مچا دیا کہ ہندوستان میں عیسائی مشنریاں کھولنے کی اجازت دی جائے۔ ۱۸۱۳ء میں عیسائی مشنریوں کو ہندوستان میں جدید سکول اور مشنریاں کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ مشنری سکول انگلش میڈیم تھے اور ان میں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ انجیل کی اخلاقیات (Ethics Biblical) بھی پڑھائی جاتی تھی۔

۱۸۳۵ء میں گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک نے انگریزی کو سرکاری طور پر ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے نافذ کر دیا

اور ۱۸۴۰ء میں سرکاری نوکریوں کے لئے انگریزی لازمی قرار دے دی گئی۔ ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۵ء تک ان مشنری سکولوں کی وجہ سے لاکھوں لوگ عیسائی ہو گئے تھے۔ ان مشنریوں نے اسلام اور رسول اکرم ﷺ کی ذات کے خلاف لٹریچر اور کتابیں شائع کیں اور پورے ہندوستان میں مناظروں کا آغاز کیا جو دلی، آگرہ اور لکھنؤ کے علما کے ساتھ کیے جاتے تھے۔ ان مناظروں اور مباحثوں کا آخری بڑا معرکہ ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں ہوا، جس میں پادری فونڈر اور رحمت اللہ کیرانوی مدمقابل تھے۔ پہلا دور جنوری میں چلا اور پھر ۱۱/اپریل ۱۸۵۴ء کو دوبارہ دونوں آمنے سامنے ہوئے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی یہ دعویٰ لے کر آئے کہ اگر میں بائبل میں تحریفات ثابت نہ کر سکا تو عیسائی ہو جاؤں گا۔ یہ معرکہ رحمت اللہ کیرانوی جیت گئے۔ اس کے صرف تین سال بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی برپا ہو گئی جس میں انگریز فتح یاب ہوا اور ہزاروں علما کو چوراہوں میں پھانسیاں دی گئیں، توپوں کے سامنے باندھ کر اُڑایا گیا اور بہت سوں کو عمر بھر کے لئے کالا پانی بھیج دیا گیا۔ رحمت اللہ کیرانوی کو گورے پاگلوں کی طرح تلاش کر رہے تھے مگر وہ قسطنطنیہ / استنبول میں خلافتِ عثمانیہ کے پاس جا پہنچے جہاں اُنہوں نے سلطان عبدالعزیز کے کہنے پر اس مناظرے میں کی گئی بحث پر مشتمل کتاب 'اظہار الحق' لکھی۔ لیکن اس بڑے مناظرے اور ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد تمام علما نے خود کو ان مناظروں و مباحثوں سے علیحدہ کر لیا اور دین کی اساس پر جو حملہ ہو رہا تھا، اس سے بچنے کے لیے اپنی نگرانی میں علیحدہ ادارے قائم کرنے کی سوچ بڑھ گئی۔

دوسری جانب انگریزی کے لازمی ہونے اور جدید نظام تعلیم کے آنے کی وجہ سے سرسید احمد خان اور نواب عبداللطیف جیسے لوگوں نے مسلمانوں کو انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا درس دیا۔ شاہ عبدالعزیز جیسے شخص جنہوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا، انہوں نے بھی انگریزی زبان سیکھنے کو جائز کر دیا۔ مولانا کرامت علی جونپوری نے گوروں کی زبان اور تعلیم سیکھنے کی بات کی۔ اسی دوران ایک اور شخصیت عبدالرحیم داہری پیدا ہوئی جو اپنے دہریہ ہونے کی وجہ سے اپنے نام کے ساتھ داہری لکھتی تھی، اس نے انگریزی زبان سیکھنے کے حق میں رسالہ بھی لکھا۔

۱۸۵۷ء سے پہلے کے ۵۰ سال کے دوران جدید تعلیم کے سکولوں سے جو تباہی ہندوستان میں آئی تھی، وہ بہت خوفناک تھی۔ مغلوں کا اتالیق کا نظام اور اسکول سسٹم ختم کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ چند انگلش میڈیم سکولوں اور کالجوں نے لے لی تھی۔ یوں صرف ۵۰ سالوں میں برصغیر کی تین نسلیں جہالت کے سمندر میں ڈوب گئیں۔ جو پڑھ لکھ جاتا، وہ دین سے متنفر اور جدید سیکولر لبرل نظریات کا حامل ہو جاتا۔ علما نے یہ سوچ لیا تھا کہ اب اوّلین فریضہ دین کی حفاظت ہے اور ہمیں علماء کی ایک ایسی کھیپ کی ضرورت ہے جو مساجد اور مسندِ ارشاد کو سنبھالے۔ [مدرسہ رحیمیہ، دہلی جہاں شاہ اسحٰق دہلوی کے حجاز کو ہجرت کر جانے کے بعد ۱۸۴۲ء کے بعد سید نذیر حسین دہلوی صدر مدرّس تھے، کے ساتھ ساتھ] اس ضرورت کا مزید ادراک کرتے ہوئے ۱۸۶۴ء

میں مولانا قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی نے دار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ شروع میں تو یہ اجازت دی گئی کہ پہلے یہاں تعلیم مکمل کریں پھر کسی انگریزی سکول میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں لیکن بعد میں یہ معمول بھی ترک کر دیا گیا۔ اس کے بعد دار العلوم ندوہ ۱۸۹۴ء میں قائم ہوا، مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ ۱۹۰۵ء میں اور مدرسہ الٰہیات کانپور ۱۹۱۰ء میں قائم کیا گیا۔ ان تمام مدارس کے علماء انگریزی پڑھنے کی اجازت تو دیتے تھے مگر خوف ایسا تھا کہ کوئی مدرسے سے اپنے طالب علموں کو جدید تعلیم کی طرف جانے نہیں دیتا تھا۔ یوں پورا ہندوستان دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ سیکولر تعلیم والے علی گڑھ اور سرکاری کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور دین پڑھنے والے اپنے اپنے مسالک کے مدرسوں میں۔

۱۸۵۷ء میں یہی ہندوستان تھا جو انگریز کو ملا تو وہ ۹۰ فیصد خواندہ اور پڑھا لکھا تھا مگر جب انگریز ۱۹۴۷ء میں اسے چھوڑ کر گیا تو یہ ۸۸ فیصد ان پڑھ اور ناخواندہ ہو چکا تھا اور صرف ۱۲ فیصد خواندہ اور پڑھا لکھا رہ گیا تھا۔ یہ ہے قافلہ لٹنے کی مختصر داستان اور لٹیروں کا تعارف۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو مہاتما گاندھی نے لندن کے انٹرنیشنل افیئرز کے انسٹی ٹیوٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”تم لوگوں نے مغلوں سے ایک پڑھا لکھا ہندوستان لیا تھا اور اب اسے مکمل طور پر ان پڑھ بنا چکے ہو۔“

یہ ہے نام نہاد ترقی اور انگریز استعمار کے احسانات کی حقیقت!

(مضمون 'یہ بستا کہ قافلہ کیوں لٹا؟': روزنامہ ۹۲ نیوز: ۲۶ تا ۲۸ر نومبر ۲۰۱۹ء)

---

۱ ضرورت تو اس امر کی تھی کہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں ہی ان کے وحدانی نظریہ تعلیم کے مطابق دین ودنیا کے جملہ علوم کی تعلیم ایک جگہ ہی دی جاتی۔ مگر ان مدارس کے مالی وسائل واوقاف پر بہ تحت ضبطی، ان کی شہادات واسناد کی نامنظوری، اور معاشرے میں ان کے خلاف سرکاری رہ رہلیے پروپیگنڈا کی وجہ سے ان مدارس کے لئے اپنے دائرہ کار کو وسیع رکھنا ممکن نہ رہا۔ یوں بھی مسلمان عوام ملازمت اور روزگار کے لئے سر سید احمد خاں کی دعوت کے نتیجے میں نئے انگریزی سکول وکالج کی طرف راغب ہوتے گئے اور مدارس کے پیسے ہوئے تعلیمی مراکز سے دنیوی علوم حاصل کرنے میں کسی کو دلچسپی نہ رہی۔

قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کو اپنے شاندار روایتی نظام تعلیم کی طرف واپس آنا چاہیے تھا جس نے پورے ہندوستان کو صدیوں تک سو فیصد شرح تعلیم دی تھی، اور تعلیمی ثنویت کی بجائے اہل پاکستان کو ایک دار العلوم میں، ایک ہی نظریہ علم کے تحت دینی ودنیاوی علوم سیکھنے چاہیے تھے، لیکن ہنوز پاکستان کی اسلامی حکومت کا رویہ دینی تعلیم اور مدارس اسلامیہ کے ساتھ، اپنی پیش رو انگریز استعمار سے مختلف نہیں ہے۔ نہ تو مسلم حکومت کی طرف سے سکول وکالج کی طرح مشاہرات وعمارات کے مالی وسائل، نہ اسناد کی منظوری اور پھر معاشرے میں آئے روز کا مخالفانہ پروپیگنڈا ابھی پوری شدت سے جاری ہے۔ ان حالات میں وحدانی نظریہ تعلیم کے برخلاف، ثنویت پر مبنی نظام تعلیم ہی نہ چلے تو اور کونسا تعلیمی معجزہ رونما ہو...؟

تاہم ایک امر ضرور واضح ہے کہ ملت اسلامیہ اور برصغیر کے شاندار نظام تعلیم کے کسی درجے میں وارث اگر کوئی ہیں تو وہ مدارس اسلامیہ ہیں، انگریز کے پروردہ تعلیمی ادارے نہیں۔ حالات کی ستم ظریفی نے ان کا حلیہ اور نقشہ بہت حد تک بگاڑ دیا ہے لیکن ان میں اسلامی نظریہ تعلیم کی روح اور اساس تا حال باقی ہے جس چنگاری کو شمع بنانے کی ضرورت ہے" (ح۔م)

علوم وفنون، افکار ونظریات اور تنظیموں وتحریکوں کے مرکز 'لاہور' میں عظیم الشان لائبریری

المکتبۃ الرحمانیۃ

اساتذہ، محققین اور اعلیٰ تعلیم کے طلبہ کی علمی ضروریات کا اہم مرکز ومرجع

خصوصیات

- ہمہ نوعیت کے موضوع پر 45 ہزار علمی و دینی کتابیں
- بین الاقوامی DDC لائبریری سکیم کے تحت مرتب شدہ
- لائبریری میں موجود کتب کو گھر بیٹھے سرچ کرنے کی آن لائن سہولت
- پاکستان میں 900 دینی رسائل وجرائد کے شماروں کا سب سے بڑا مرکز
- فاضل شخصیات اور ماہر لائبریرین کے ذریعے موضوع تک رہنمائی
- قدیم وجدید تحقیقات کے حامل جدید ایڈیشن
- عرب ممالک سے شائع ہونے والی نئی کتب کا مرکز
- فوٹو کاپی کروانے کی سہولت اور مسجد کا انتظام
- پرسکون محل وقوع اور تعلیمی اداروں کے سنگم میں

سہولیات

- جملہ اُردو وعربی تفاسیر اور علومِ قرآن کی تمام کتب
- حدیث نبوی، شروحِ حدیث اور علوم قرآن کے بیشتر مراجع
- فقہی مذاہب خمسہ کی اُمہات الکتب اور جدید فقہی موضوعات کا مستند ذخیرہ
- اسلامی سیاسیات واقتصادیات اور عمرانیات وغیرہ سے متعلقہ بیش بہا خزانہ
- اسلامی قانون سے متعلقہ جملہ اہم پہلوؤں پر اَسلاف کا نادر علمی ورثہ
- Ph.D وغیرہ محققین کے لیے علمی رہنمائی اور مشاورت

اوقات صبح 09:00 بجے تا شام 05:00 بجے (چھٹی بروز جمعہ)

ایئر کنڈیشنڈ ہال

بمقام دارہ 'محدث' 99/ جے ماڈل ٹاؤن، لاہور 042-35866396 لائبریرین: محمد اصغر 0305-4600861

Designing: AK 0321-4966404